قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اناسی واں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

فروری 2022ء

"لَا نَبِيَّ بَعْدِي" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائد اعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

پرویز

09 جولائی 1903ء

24 فروری 1985ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

-1 عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

-2 قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

-1 وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

-2 وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

-3 وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

فروری 2022ء
جلد 75 شمارہ نمبر 02

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: غلام احمد پرویزؒ اور تحریکِ طلوعِ اسلام	ادارہ	4
حقیقی تبدیلی کیسے آئے گی؟	ادارہ	19
اقبالؒ اور پرویزؒ	محمد سلیم اختر، لاہور	34
جناب پرویز صاحبؒ سے پہلی ملاقات	ملک منظور حسین لیل ایڈووکیٹ، بھکر	44
قرآن کریم کا انقلاب انگیز اور انسانیت ساز نعرہ	خواجہ ازہر عباس، کراچی	54
بچوں کا صفحہ: پرویزؒ کا پیغام بچوں کے نام	محمد ارشد، سلیم اختر	56

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No. 3	61

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25 گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے
غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے
یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

غلام احمد پرویزؒ اور تحریکِ طلوعِ اسلام

(مختصر تعارف)

علامہ اقبالؒ نے دمِ واپسیں فرمایا تھا:

سرُودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

علامہ غلام احمد پرویزؒ (رحمۃ اللہ علیہ) کی ولادت مورخہ 9 جولائی 1903ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ آپ کے دادا، مولوی، چوہدری، رحیم بخش حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک ممتاز بزرگ ہونے کے علاوہ ایک ماہر طبیب اور سنسکرت کے عالم تھے۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ابتدائی تربیت اپنے دادا کی زیرنگرانی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کی نگاہ کی مشرقی مغربی افقین کافی وسیع اور ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں کافی عمیق ہو چکی تھیں۔

بعد ازاں سول سروس میں چلے گئے اور 1954ء میں جب کہ آپ وزارتِ داخلہ میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تاکہ اپنے قرآنی مشن کو پورا وقت دے سکیں۔

اس دوران میں آپ کی زندگی علمی معرکہ آرائیوں سے عبارت رہی۔ 1932ء میں ابوالکلام آزاد کے تفسیری ترجمہ، ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ انہوں نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلے میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ:

> اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت تا بہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جراَتِ ایمانی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

''عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان

کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔''

علامہ پرویزؒ کی بصیرتِ قرآنی کے مطابق یہ نظریۂ اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ برہمو سماج کی تعلیم تو ہو سکتی ہے قرآن کی نہیں۔ اس لئے آپ نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) (سید سلیمان ندوی کی زیرِ ادارت) کی جنوری 1933ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت تابہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جراَتِ ایمانی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

آخرالامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ علامہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں وضاحت کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد علامہ پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔ بعد میں آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت'' 1974ء میں شائع کی۔

1926ء میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کرنے سے مرتد ہو گیا ہے لہٰذا اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخرالامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ علامہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں وضاحت کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد علامہ پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔ بعد میں آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت'' 1974ء میں شائع کی۔

علامہ اقبالؒ کے خاکہ کے مطابق جناب پرویزؒ نے سلسلہ ''معارف القرآن'' کی ابتدا 1928ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا۔ ''اللہ'' جو بعد میں ''من و یزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ پھر ''ابلیس و آدم'' تحریر کی۔ جس میں آدم۔ ابلیس۔ ملائکہ۔ جن۔ شیطان۔ وحی۔ رسالت وغیرہ عنوانات پر قرآنی تصریحات پیش کی گئیں۔ معارف القرآن کی تیسری جلد ''جوئے نور''۔ چوتھی جلد ''برقِ طور'' اور پانچویں جلد ''شعلۂ مستور'' حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء کرامؑ کے حالات زندگی کو محیط ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ بعنوان ''معراجِ انسانیت'' شائع کی۔ وحی کی ضرورت اور اہمیت اجاگر کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سال کی فکری کاوشوں کا نچوڑ۔ ''انسان نے کیا سوچا''۔ کے عنوان سے ایک کتاب میں پیش کیا۔ جس کو پڑھنے سے یہ حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ عقلِ انسانی۔ انسانی مسائل کو حل کرنے میں کس طرح ناکام

رہی ہے اور پھر یہ بتانے کے لئے کہ وحی کی رو سے انسانی مسائل کا حل کیا ہے۔ آپؒ نے ایک کتاب بعنوان۔ ''اسلام کیا ہے؟'' شائع کی۔ معاشی مسئلہ ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں معاشی نظریات کی بنیاد پر دنیا دو بڑے بلاکوں میں منقسم تھی۔ اس مسئلہ کے قرآنی حل کو پیش کرنے کے لئے آپ نے متعدد تقاریر کیں اور مضامین شائع کئے جن میں سے کچھ ''خدا اور سرمایہ دار'' نامی کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط تصنیف ''نظام ربوبیت'' شائع کی۔

تقدیر کا مسئلہ صدیوں سے الجھا چلا آ رہا ہے۔ اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے آپؒ نے ''کتاب التقدیر'' تحریر کی۔ آخرت کے متعلق قرآنی توضیحات کو ایک کتاب بعنوان ''جہانِ فردا!'' میں شائع کیا اور اس طرح قریب چالیس سال کی محنتِ شاقہ سے سلسلہ معارف القرآن کو تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی کتاب فجر الاسلامؔ میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دیگر قوموں کے تصورات کس طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے گئے اور یوں قرآن کے تصورات کی جگہ غیر قوموں کے تصورات نے لے لی۔ چنانچہ آج جسے مذہبِ اسلام کہا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں سے مستعار تصورات کا جن پر لیبل قرآنی اصطلاحات کا لگا دیا گیا ہے۔ ان تصورات سے اور تو اور عربی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ کا کوئی ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں نہ صرف الفاظ کے وہ معنی دیئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے بلکہ ان الفاظ کے پس منظر میں قرآنی تصورات کی بھی وضاحت کی جائے۔۔۔۔ یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا' لیکن اگر انسانوں کی ایسی جمعیّت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لئے استعمال کئے۔

یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا' لیکن اگر انسانوں کی ایسی جمعیّت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لئے استعمال کئے

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ جناب پرویزؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''اس لغت کے شائع ہونے کے بعد ایک دن ایک عراقی عالم مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ حکومتِ پاکستان کے رابطۂ عوامی کے ایک آفیسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس نے کہا کہ عراقی علماء کی ایک تنظیم قرآنِ مجید کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے چاہا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کا لغت مدون کرنے کا کام ہوا' یا ہو رہا ہو' ان حضرات سے مل کر اس سلسلہ میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم کون سی ہے جس کے زیر انتظام تمہارے لغت کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ وہ جماعت کن علماء پر

مشتمل تھی، جس نے اس لغت کو مرتب کیا۔ اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا۔ اس پر کس قدر خرچ اٹھا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کس نے کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی، نہ جماعت، نہ کوئی مالی ذریعے تھے نہ مادی اسباب۔ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ تمام کتابیں بھی تصنیف اور شائع کی ہیں جو آپ کو ان الماریوں میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ صاحب خندۂ زیر لبی سے یہ سب کچھ سنتے رہے۔ میں کسی کام کے لئے گھر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایکا ایکی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت طنزیہ انداز سے علیک سلیک کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ ان کا یہ انداز اور اقدام ایسا ناقابل فہم تھا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ کچھ دنوں بعد، رابطۂ عوامی کے اس افسر سے جو ان کے ساتھ آئے تھے سرِ راہ میری ملاقات ہوئی، تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس دن کیا بات ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ اندر گئے ہیں تو ان صاحب نے کہا یہ شخص بالکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص تنہا اتنا کام کرلے، سو جب یہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتا تو اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میں یہ سن کر مسکرایا اور ان سے کہا کہ خیر گذری میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس دوران میں میں نے تیس سال سرکاری ملازمت بھی کی ہے (اس نے اسے بتا دیا تھا)۔''

قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد جریدہ تھا جس نے تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ تحریک پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جاسکتی

(طلوع اسلام، دسمبر 1978ء صفحہ:49)

سلسلۂ معارف القرآن اور لغات القرآن کے علاوہ جناب پرویزؒ نے ''مفہوم القرآن'' تین جلدوں میں مرتب کیا۔ قریب ڈھائی ہزار عنوانات کے تحت قرآنی مضامین کو مرتب کر کے ''تبویب القرآن'' شائع کی اور ''مطالب الفرقان'' کے نام سے تفسیر مرتب کر رہے تھے جس کی سات جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) اور ''طاہرہ کے نام خطوط'' قرآنی تعلیمات پر مشتمل ادب پارے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اسلامی معاشرت اور پھر قرآن کے بیان کردہ قوانین۔ بعنوان ''قرآنی قوانین''، اور انگریزی زبان میں کتاب۔۔۔۔ (Islam a Challenge to Religion) اس پر مستزاد ہیں۔ غرض کس کس کاوش کا ذکر کیا جائے۔

ان علمی کارناموں کو سرانجام دینے کے علاوہ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد

جریدہ تھا جس نے تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جا سکتی۔

قائداعظمؒ پروٹوکول کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ انہیں کوئی شخص پیشگی وقت لئے بغیر نہیں مل سکتا تھا لیکن یہ شرف جناب پرویزؒ کو حاصل تھا کہ آپؒ کسی بھی وقت قائداعظمؒ سے ملاقات کر سکتے تھے۔ باوجود اتنے قریب ہونے کے جناب پرویزؒ نے کبھی اس بات کو فخر یہ بیان نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان بن جانے پر کوئی مراعات حاصل کیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جنوری 1948ء میں آپؒ نے دوبارہ طلوع اسلام شائع کرنا شروع کیا۔ جو باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے دشمن عناصر بھی یہاں ہجوم کر کے آ گئے اور یہاں آ کر پر پرزے نکالنے لگے۔ اب ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم اگر پاکستان بن ہی گیا ہے تو اس میں وہ نظام نہ رائج ہونے دیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ اسلام کی آڑ میں یہاں تھیا کریسی رائج کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اب دوبارہ جناب پرویزؒ کو ان کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا۔ قرار دادِ مقاصد اور علماء کے بائیس نکات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن پر جناب پرویزؒ نے تفصیلی تنقید کی۔ آپؒ نے تفصیلاً بتایا کہ جسے علماء' سنت کہتے ہیں وہ نہ تو متفق علیہ ہے کہ اس کی رو سے کوئی متفق علیہ قانون مرتب کیا جا سکے۔ علماء کا سنت پر اس قدر زور دینا محض اس لئے ہے کہ یہاں قرآنی نظام رائج نہ کیا جا سکے۔ مخالفین سے آپؒ کے پرزور دلائل کا جواب تو بن نہ پڑا۔ انہوں نے آپؒ کے خلاف فتویٰ کفر دے دیا جس پر ایک ہزار ''علماء'' کے دستخط ثبت تھے۔

ضخیم تصانیف کی لمبی فہرست۔ ماہنامہ طلوع اسلام کے ہزار ہا صفحات۔ ہفتہ وار درس اور تقاریر کے ٹیپس (Tapes) کا ڈھیر جواب سی ڈی/ ڈی وی ڈی میموری کارڈز کی شکل میں دستیاب ہیں نیز تسوید کے بعد طباعت بھی ہو رہی ہے۔ تحریکِ پاکستان میں' باوجود سرکاری ملازم ہونے کے سرگرم شمولیت' قائداعظمؒ سے قرب حاصل ہونے کے باوجود مراعات حاصل کرنے سے انکار' اپنے خلاف فتوؤں سے بے پروا ہو کر اپنے مشن میں مگن۔ اپنی ہزار سالہ تاریخ کھنگال ڈالئے۔ ہے کوئی ایک بھی ایسا شخص جس نے تنِ تنہا اتنا زیادہ اور اتنا ٹھوس کام کیا ہو؟

5 اکتوبر 1984ء کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہے۔ اور 24 فروری 1985ء کو شام چھ بجے آپؒ اس دارفانی سے انتقال فرما گئے۔

کیونکہ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ (55:26-27) ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

☆......☆......☆

تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف

(بانیٔ تحریکؒ کے الفاظ میں)

تقسیم سے قبل گو طلوعِ اسلام کا مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید دورِ حاضرہ کی اصطلاح یا مفہوم میں ایک ''سیاسی مقصد'' کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ طلوعِ اسلام کا مؤقف قرآنی تصور کی ہمنوائی میں یہ تھا کہ اسلام ایک دین (یعنی نظامِ مملکت) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اقدار کی حکمرانی ہو۔ اس طرح یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزیں کرتا چلا گیا کہ اسلام کا مقصود کیا ہے اور دین کا مطمحِ نگاہ کیا، وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور وہ ضابطہ یا نظام کس طرح دیگر نظامہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے۔ وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کر سکتا اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔

> جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جا رہی ہے اور بری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے۔

نظامِ خداوندی کو ایک آزاد خطۂ زمین پر مشہود کرنے کی یہی وہ حسین آرزو اور مقدس تمنا تھی جس کو لے کر حصولِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام پھر جادہ پیما ہوا۔ اس کے نزدیک حصولِ مملکت کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دین کے جن امور کو وہ اب تک اصولی طور پر پیش کرتا چلا آیا ہے ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈال کر اس کے نمایاں خط و خال امت کو دکھائے اور قرآن ہی کی روشنی میں اس کے قیام کی موجودہ عملی صورت کا تعین کرے۔ طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر دوسرا کام یہ تھا کہ وہ تمام سلیم قلب، سعید روحیں اور جو قرآنِ کریم کے اس حیات آفریں پیغام سے ہم نوا ہیں لیکن کسی مرکز کے نہ ہونے کے سبب تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے بے خبر اطراف و جوانبِ ملک میں الگ الگ پڑی ہیں اور باوجود ہزار بار سوچنے کے آگے قدم نہیں اٹھا سکتیں کہ وہ اس میدان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں انہیں یک دلی اور ہم مشربی کے رشتۂ محکم میں منسلک کر کے ایک ذہنی مرکز پر جمع کر لیا جائے اور اس طرح ان افراد کے اجتماع سے وہ قافلہ مرتب ہو جائے جس کا ہر قدم صحیح منزل کی طرف اٹھے۔

جہاں تک قرآنی نظامِ زندگی کے خط و خال کا تعلق ہے اس کی تفصیل طویل ہے اور اس مختصر وقت میں اسے پیش کرنا دشوار۔ محترم پرویزؒ صاحب نے اس کو وضاحت کے ساتھ رسالہ طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات اور بیسیوں کتابوں کی شکل میں

نقش کر کے انہیں ملک میں عام کر دیا ہے اور جن کا چرچا آپ چہار اطرافِ عالم میں سنتے ہیں لیکن مختصر طور پر پرویزؒ صاحب نے جو طلوع اسلام کے مقصد کی وضاحت میں پیش کیا ہے' یہ ہے:

(1) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔ خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(2) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(3) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(4) رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنھم) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(5) رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا یہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا جن میں کسی ردوبدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا' جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہٖ باقی رکھا۔

(6) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا' اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(7) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا امت کے مختلف فرقے' جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ہم میں جو عقائد و رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تا کہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(8) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آ سکتی ہے' نہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(9) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے

لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ تک مختلف علوم وفنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ سب انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے۔

(10) نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرفِ انسانیت کی معراج کبریٰ کی مظہر تھی لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات وتاریخ میں ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جن سے حضور ﷺ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضور ﷺ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے صحنِ چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(11) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے' احکام اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔

(12) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(13) قرآنی نظام میں تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم یا سوشلزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آئند ہو سکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ تھے دینِ خداوندی کے وہ خط وخال جنہیں طلوع اسلام .... نہایت مستقل مزاجی سے عوام کو دکھا تا رہا اور یہی تھی آہن کی وہ فسان جس سے ریت میں ملے ہوئے فولادی ذرات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہو گئے اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس حیات آفریں پکار پر کھنچے چلے آئے۔

انہی افراد پر مشتمل تنظیمی ہیئت کا نام ''بزم طلوع اسلام'' ہے۔ ان بزموں کا مقصد اور مشن طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

قرآنی پیغام کے عام کرنے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی کہ جب کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو

جائے تو وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس موڈ میں ہی نہیں ہوتا کہ پیش آمدہ مسائل پر عقل وبصیرت کی رو سے غور کرے اور دلائل و براہین کے مطابق کسی فیصلے پر پہنچے۔ افراد کے مجموعے ہی کا نام قوم ہوتا ہے اور جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جا رہی ہے اور بری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے۔ یوں تو مغرب کی خدا فراموش سیاست کی بدولت انتخابات کی وبا ہر جگہ آندھی بن کر اٹھتی اور جھکڑ بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بدقسمتی سے اس نے اور ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں ایک طبقہ انسان کی طبیعی ضروریاتِ زندگی کے حصول کو اپنا مطمحِ نظر بنائے ہوئے ہے اور صرف اسی میں انسانیت کے فلاح و بہبود کا راز بتاتا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ اپنی ہر چیز کو داؤں پر لگائے بیٹھا ہے۔ دوسری طرف نظریۂ پاکستان کے مخالفین عوام کے ان جذبات کو مشتعل کرنے میں پوری شدت سے سرگرمِ عمل ہیں جن کا تعلق قلبِ انسان کے نہایت نرم و نازک گوشوں سے ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ تحریکِ طلوع اسلام دینِ خداوندی کے فروغ اور نظامِ ربوبیت کے قیام وعمل کی پیامبر ہے ان حالات میں ایک طرف مذہب پرست طبقہ ہم سے متقاضی ہے کہ 'دین خطرہ میں ہے۔ اس لئے آپ ہمارے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کیجئے۔ دوسری طرف سرمایہ داری کے ظلم و استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی خون آشامیوں' عیاریوں اور مکاریوں کا شکار طبقہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم نظامِ ربوبیت کے پیامبر ہو اس لئے سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو دفن کرنے میں ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ تیسری طرف تحریک میں شامل وہ نئے نوجوان ہیں جن کی بے تابئ تمنا دبی زبان سے یہ شکوہ کرتی ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ہماری موجودہ رفتار نہایت سست ہے۔ اس کے لئے ہمیں باہر نکلنا چاہئے۔ سوشل ورک کر کے ہمیں عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنی چاہئیں اور یوں عوام کی طاقت حاصل کر کے غیر قرآنی نظامِ کہن کی جگہ دینِ خداوندی کا نفاذ کرنا چاہئے۔

اندریں حالات، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تحریکِ طلوع اسلام کے مقاصد' نصب العین اور اس کے حصول کے لئے طریقِ کار کو مختصر طور پر خود بانئ تحریک کے الفاظ میں پیش کر دیں۔

دستور اساسی واصولی ہدایات برائے بزمہائے طلوع اسلام کی پہلی شق یہ ہے:۔۔

> ''بزمِ طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ' یہ ایک اجتماعی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشرواشاعت کے لئے جسے ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں' انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جو عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا۔''

چنانچہ طلوع اسلام کی پہلی کنونشن منعقدہ 1956ء میں محترم پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا:

''اس کے بعد میں اس کے دوسرے گوشے کی طرف آتا ہوں جو اس پہلے گوشے سے بھی زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ لطیف اتنا کہ بعض اوقات اسے صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب بغیر گروہ بندی اور پارٹی بازی کے برپا کیا جائے۔ چونکہ دورِ حاضرہ میں معمول یہ ہے کہ کوئی تحریک بغیر پارٹی بازی کے وجود میں نہیں آتی اس لئے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ پارٹی بازی کے بغیر بھی کوئی تحریک چل سکتی ہے۔ لیکن برادران! قرآن کریم سے جو کچھ تھوڑی بہت بصیرت میں نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملت کے اندر تعمیری انقلاب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی پارٹی بنائے بغیر ان میں فکری تبدیلی پیدا کرتے جائیں...... قرآن کریم غیر مسلموں کے مقابلہ میں مومنین کو الگ جماعت، ایک جداگانہ امت قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امت کے اندر فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے، بعض احباب کہتے ہیں کہ قرآن مذہبی فرقہ کو تو شرک قرار دیتا ہے، سیاسی پارٹی کو شرک نہیں ٹھہراتا، ذرا سوچیئے کہ جس اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہی نہیں اس میں مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مذہبی فرقہ ہو یا سیاسی پارٹی دونوں تفریق فی الدین ہیں۔ پھر کہا یہ جاتا ہے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے لئے اجتماعی کام کی ضرورت ہے، انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر پارٹی بنانا منع ہے تو یہ اجتماعی کام کس طرح سے ہو سکے گا۔ یہ اجتماعی کام منظم کوشش (Organised Effort) سے ہو سکے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ پارٹی بازی اور منظم کوشش میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے تحذب (پارٹی بازی) کی نفسیات کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جہاں کہا ہے کہ: كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32) پارٹی کی عمارت تعصب کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور دوسروں سے نفرت کے جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے ممبر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی سعادتیں اور حسنات ان کی پارٹی میں جمع ہیں اور پارٹی سے باہر جتنے لوگ ہیں ان میں کوئی خوبی اور نیکی نہیں۔ اس سے ان کے اندر نخوت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو سخت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی ذلیل اور حقیر لوگوں میں سے جب کوئی ان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل بن جاتا ہے۔ پھر اس میں دنیا بھر کی خوبیاں آجاتی ہیں۔ اگر وہ پارٹی کے ساتھ وفا شعار (Loyal) رہتا ہے تو اس کا ہر عیب ہنر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اس کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے عیب اسکی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جی بھر کر بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ پارٹیوں کے ساتھ متمسک رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کی تقویت ہر رکن کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا عین جہاد سمجھا جاتا ہے۔

دوسروں کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو‘ وہ اسے کبھی نہیں سنتے اور اگر کبھی مجبوراً سننا پڑے تو اس کا تمسخر اڑاتے اور استہزاء کی ہنسی ہنستے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا محبوب ترین مشغلہ دوسروں کی تذلیل وتحقیر ہوتا ہے‘ جس میں وہ بڑی لذت لیتے ہیں............ یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک پارٹی ترتیب پاتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے منظم کوشش کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے قرآنی نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور جن کی آرزو یہ ہے کہ یہ نظام پھر سے ملت میں متشکل ہو جائے‘ وہ سب سے پہلے اس کی بنیادی خصوصیات خود اپنے اندر پیدا کریں اور پھر اس نظام کے تصور کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہوتی جائے۔ اس نظام کے متشکل کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں اور دوسروں کی نشوونما میں اپنی ذات کی بالیدگی اور ارتقاء کا راز سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جو افراد اس مقصد کے حصول کے لئے منظم کوشش کرنے کے لئے اٹھیں‘ ان میں پارٹی بازی کی لعنتوں میں سے کسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہوگا۔ وہ دوسروں سے نفرت نہیں‘ ہمدردی کریں گے۔ وہ ان کی بہبود کا سامان مہیا کرتے پھریں گے۔ وہ اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنے کام کی ابتدا بےشک کسی ایک مقام سے کریں گے لیکن پوری نوعِ انسانی ان کی برادری اور ساری دنیا ان کا گھر ہوگی۔ ان کی مساعی‘ خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کی مظہر ہوں گی۔ اس میں ان کے ذمہ زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانیاں ہوں گی اور دوسروں کے لئے بیش از بیش نفع بخشیاں اور راحت سامانیاں‘‘۔

ایک دوسرے مقام پر پرویزؒ صاحب نے فرمایا:

’’قرآنِ کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں‘ اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکتا‘ اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا‘‘۔

ایک اور مقام پر موصوف نے کہا:

’’حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رو سے‘ انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رو سے احترام انسانیت‘ انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم واستبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ تبدیلی یقین (Conviction) سے آتی ہے اور (Conviction) کی بنیاد دلائل

وبراہین کی رُو سے دل ودماغ کے اطمینان پر ہے۔اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں''۔

''دنیا میں ساری قوتوں کا راز ایمان میں مضمر ہے۔جس قدر آپ کا یقین محکم ہے اسی قدر نا قابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں۔شکست و کامرانی کا بنیادی مدار ساز وسامان پر نہیں، یقین اور عدمِ یقین پر ہے۔جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہوگا وہی دنیا میں کامیاب وشادکام ہوں گے۔ یہی شکست وفتح کا اٹل پیمانہ ہے۔اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔جب یقین ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے اور ایمان ہو اللہ واحد القہار پر تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلا سکتی''۔

''(نظام خداوندی) کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے۔شعور کی یہ بیداری اور فکر ونظر کی یہ تبدیلی اس نظام کے تصور کے عام کرنے میں اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگہِ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔اسی کا نام تعلیم کتاب وحکمت ہے۔نبیِ اکرم ﷺ نے اسی نقطۂ سے آغاز کار کیا تھا......اس تصور کو عام کرنے سے ایسے' سعادت مند افراد نتھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن کی نگاہوں میں کشادگی اور قلب میں وسعت ہوتی ہے۔اسی کا نام نفس کی بالیدگی ہے اور تعلیم وحکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا تعلق ہے''۔

تعلیم وحکمت کی وضاحت کرتے ہوئے پرویزؒ صاحب نے لکھا:

''تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہے اور تزکیہ کا تعلق قلبِ انسانی سے۔کسی حقیقت کو اس انداز سے واضح کر دینا کہ وہ دوسرے کی سمجھ میں آ جائے، تعلیم ہے۔تعلیم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہو سکتی ہے قلبی ایقان نہیں۔دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں ہوتی، اس کے لئے قلبی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جو درحقیقت اعمالِ انسانی کا سرچشمہ ہے، جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب و تطہیر فکر پر نہیں وہ نظام کبھی نشو وارتقاء انسانیت کا کفیل نہیں ہو سکتا۔اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔بہترین دساتیر وقوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کر سکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور ان پر عمل کرنے والی قوم کے قلب ونگاہ کی اصلاح نہ ہو چکی ہو۔عمل کا محرک جذبہ، قوتِ ارادی ہے اور قوتِ ارادی کا تعلق دل سے ہے، دماغ سے نہیں۔اس لئے تنہا علم عمل کا محرک نہیں ہو سکتا۔قرآن اس قسم کی سوسائٹی تشکیل کرتا ہے جو اطاعتِ احکام میں اپنی ذات کی تسکین محسوس کرے۔قلب کی اس کیفیت کا نام تزکیہ ہے۔جب قرآن قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور داخلی دنیا کی اس تبدیلی سے خارجی دنیا میں انقلابِ عظیم آ جاتا ہے۔قرآن یہی انقلاب پیدا کرتا ہے''۔

(موصوف نے کہا)۔''قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔

وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کے محرک ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ، عقل اور عشق، جنون اور خرد، ذکر اور فکر، خبر اور نظر، دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے اور جو چیزیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں، وہ بھی درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہیں۔ ''جنون اور خرد'' جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنا دینا قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے۔۔۔ اس قسم کا عقل اور جنون کا امتزاج جس میں نہ تو جنون مذہبی دیوانگی سکھا دے اور نہ ہی عقل اس جنون کی چنگاری کو اپنی خاکستر کے نیچے دبا کر بجھا دے، قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ہیں وہ اربابِ ''خرد وجنون'' جنہیں وہ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (3:190-191) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ اربابِ عقل وبصیرت جو زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے میں وحی کی راہنمائی کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور کائنات کی گہرائیوں اور بلندیوں پر بھی غور و فکر کرتے ہیں، یہی ہیں وہ مکمل عدل کا ''خواب'' دیکھنے والے جو اس ''خواب'' کو ایک زندہ حقیقت بنا کر رکھ دینے کے اہل ہوں''۔

طلوع اسلام کی دوسری سالانہ کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے فرمایا:

''جو جماعت قرآنی نظامِ ربوبیت کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھتی اور اپنے اللہ سے بیع وشریٰ کا معاملہ کرتی ہے اس کے نفع اور نقصان کے ماپنے کے پیمانے اور اندازے دوسری جماعتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام جماعتوں کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنے ممبر بھرتی کئے۔ کس قدر روپیہ فراہم کیا۔ کتنے جلسے کئے، کتنے جلوس نکالے، مخالفین کو دبانے کے لئے کون کون سے حربے استعمال کئے اور اس طرح انتخابات میں کتنی نشستیں حاصل کیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ ان کا قلب ودماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت وکردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں، وہ اپنی ذات، اپنے اعزہ واقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانینِ خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو، قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں''۔

طلوعِ اسلام کی ساتویں کنونشن میں موصوف نے کہا:

''انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے' قدیم تصوراتِ حیات اور نظامہائے زندگی کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے' ملوکیت' سرمایہ داری' مذہب' سب ایک ایک کر کے اٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں......اس وقت لا کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر الا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد' ان کے مقام سے ہٹانے' یا الا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے''۔

طلوعِ اسلام کی نویں کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے فرمایا:

''یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس سال سے مسلسل پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا' مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔ جو شخص لوگوں کے سامنے ان کے مروجہ عقائد اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے' پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے' اسے ان کا مسلمہ لیڈر' راہنمائے شریعت یا مرشد طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن جو شخص ان کے غلط عقائد اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے' انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے' وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔ میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزری تھی اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا' اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اسکا قائد بن جانا' میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق بخشی کہ میں ان تمام نگاہ فریب جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر' قرآن کی آواز پر لبیک کہوں' اور اس طرح دنیا جہان کی مخالفت مول لے لوں' میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جانتے بوجھتے' سوچتے سمجھتے کیا اور مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پُرخار وادیوں کو اختیار کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی مشقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخ اقوام کے مطالعہ سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اے مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے' مذہب چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے یا ختم ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

یہ تو دین کا خاصا ہے کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسے کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہم بھی اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہ رہے' تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکے گا؟ فطرت کے قانون کے مطابق' ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا' اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہوجانے کے بعد' اگر اس قوم کے سامنے دین نہ ہو' تو وہ دہریت اختیار کرلیتی ہے' اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں سیاست' مستقل اقدار سے الگ ہوجاتی ہے اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں) ''چنگیزیت'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصا یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی' اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آجائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو' تو اس سے دنیا جس جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگہٗ بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے' وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ادھر کا رخ کرے' یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تاکہ دنیا میں ایک خطہ زمین تو ایسا ہو جو خدا کی پروردگاری کا مظہر بن سکے''۔

طلوع اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن میں پرویزؔ صاحب نے اراکین بزمہائے طلوع اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں نے زمیلانِ گرامی قدر! قرآن کریم کی اس روشنی کو چراغِ راہ بناتے ہوئے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد' نہایت سکون و خامشی' لیکن انتہائی التزام و استحکام کے ساتھ' قرآنی فکر کو عام کئے جانا ہے۔ اس میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری کا کوئی دخل نہیں۔ ہمارے دستور اساسی کی ایک شق یہ ہے کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیں گے اس لئے اس تحریک کے ساتھ وابستگی سے نہ تو کوئی سیاسی مفاد عاجلہ حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں نمود و نمائش کی کوئی گنجائش اور شہرت و ناموری کا کوئی مقام ہے۔ یہاں تو دنیا بھر کی مخالفت کو نہایت سکون و اطمینان سے برداشت کرنا' اور لب تک ہلائے بغیر اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے' اس بزمِ شوق میں پروانے کی طرح جل کر مرجانا اور زبان سے اُف تک نہ کرنا ہے' دوسری طرف مفاد عاجلہ کے جہانِ رنگ و بو سے یوں بیگانہ وار گزر جانا ہے کہ اس کی کوئی کشش و جاذبیت آپ کی دامنگیر نہ ہو''۔

یہ ہیں قرآنی حقائق پر استوار اس تنظیم کے مقاصد' اور یہ ہے وہ مخصوص اور متعین طریقِ کار (ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب) جسے اس تحریک نے اپنے روزِ اول سے اختیار کر رکھا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ اس قسم کی تحریک آپ کے تعاون کی مستحق ہے یا نہیں۔ والسلام!

حقیقی تبدیلی کیسے آئے گی؟

زیرِ نظر شمارہ کے لمعات، محترم پرویزؔ صاحب کے رشحاتِ قلم کی نذر ہیں ـــــ مندرجہ ذیل خط کے مضمون سے ملتے جلتے خطوط ادارہ کو اب بھی موصول ہوتے ہیں۔ ایسے مراسلات کا جواب آج بھی وہی ہے جو پرویز صاحب نے قریباً چوالیس برس قبل درجِ ذیل مراسلہ کا دیا تھا۔ تبدیلی اور اس کے طریق کار پر یہ ایک جامع و مانع تحریر ہے جسے آپ کی نذر کیا جارہا ہے۔ (ایڈیٹر)

طریق کار

ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے:۔

مکرمی و محترمی جناب پرویزؔ صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی کتاب "ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION" پر ''پاکستان ٹائمز'' میں ریویو اور اس کے بعد اس پر ایک خط 25 اکتوبر 1969ء نظر سے گزرا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر سوچنے والے شخص کے سامنے یہی سوال ہے کہ:

The only thing which is missing from it is the methodology of bringing into being the "Rububiyat Order" which forms the core of Mr. Parwez's social and political philosophy.

ذہن یہ باور ہی نہیں کرتا کہ آپ جو اتنے عرصے سے اس راہ کے مسافر ہیں، اس کے جواب سے معذور ہوں۔ آپ کے پاس یقیناً اس کا جواب ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ جواب اُس منزل سے پہلے ظاہر کر دیا جائے جس میں وہ جواب عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ لیکن جو لوگ آپ کی طرح اس راہ پر چل رہے ہیں اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ سوال ان کے ذہن میں بھی پیدا ہوگیا (جیسے راقم الحروف اور اس کے چند ساتھی)۔ ان سے اس جواب کو ''چھپا کر رکھنا'' بھی ایک قسم کا بخل ہے جس کے آپ مرتکب نہیں ہوسکتے۔ اس لئے از راہِ کرم مکمل طور پر یا چند سطور میں بطور خُلّص چند اشارات کی شکل میں راقم الحروف کو لکھ بھیجیں تو بندہ نوازی سے بعید نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بیش از بیش علم و حکمتِ قرآنی سے نوازے۔　　فقط والسلام!

مجھے اس مضمون کے کئی خطوط، کئی ایک دیگر احباب کی طرف سے بھی موصول ہوئے ہیں۔ اس بنا پر (نیز مسئلہ کی اہمیت کا بھی یہی تقاضا تھا) میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان احباب کو فرداً فرداً جواب دینے کے بجائے (ماہنامہ) طلوعِ اسلام کی

وساطت سے اس مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔

میں سب سے پہلے محترم مستفسر کی خدمت میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بات یہ نہیں کہ میں اس اہم سوال کے جواب کو اس منزل سے پہلے ظاہر نہیں کرنا چاہتا جس میں وہ جواب 'عمل' میں لایا جا سکتا ہو۔ میں نے جس مقصد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا ہے اس میں کوئی راز ایسا نہیں جسے کسی خاص وقت تک کے لئے پوشیدہ رکھنا ضروری ہے —— بلکہ یوں کہئے کہ اس میں راز کوئی بھی نہیں۔ اس میں تو کیفیت یہ ہے کہ —— سخنے نگفتہ راچہ قلندرانہ گفتم ہے —— اس قسم کی مصلحت کوشیاں، عملی سیاست کے میدان کے نبرد آزماؤں کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور میں نے نہ اس میدان میں قدم رکھا ہے نہ قدم رکھنے کا ارادہ ہے۔ اس لئے ہر چہ گویم قلندرانہ گویم۔ فالحمد للہ علی ذلك!

جہاں تک میری کتاب پر تبصرہ کے ضمن میں ان ریمارکس کا تعلق ہے جنہیں مندرجہ بالا خط میں دُہرایا گیا ہے، میں (محترم تبصرہ نگار سے معذرت کے ساتھ) جراتِ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے یہ ریمارکس بے محل تھے۔ میری کتاب کا موضوع یہ ہے کہ اسلام، ایک دینؔ ہے، مذہب نہیں اور جب تک اسے مذاہبِ عالم کے زمرے سے الگ نہیں کیا جاتا، نہ اس کی حقیقت سمجھ میں آ سکتی ہے، نہ اس کا مقصود و منتہیٰ۔ کتاب کا بیشتر حصہ، مذہب اور دین کے بنیادی فرق کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد، میں نے مثبت طور پر بتایا ہے کہ قرآنِ کریم جس دین، (یعنی نظامِ حیات) کو پیش کرتا ہے، اس کے اصولی خط و خال کیا ہیں اور وہ دیگر نظام ہائے حیات سے کس طرح مختلف اور متمیز ہے۔ کتاب کی ساری بحث فکری ہے اور وہ اسلام کا صحیح تصور پیش کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے سلسلہ میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس میں اس نظام کو پاکستان میں عملاً متشکل کرنے یا نافذ کرنے کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گیا۔

> اقبالؔ نے اپنے آپ کو فکری مباحث تک محدود رکھا اور حصولِ مقصد کے لئے عملی طریق کار تجویز نہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبالؔ کی دیدہ وری اور دور نگہی تھی جو انہوں نے ایک مفکر کے صحیح مقام اور منصب کو سمجھ لیا اور عملی طریق کار کو اس مرد سیاستدان کے سپرد کر دیا جس کی فراست اور دیانت پر انہیں اعتماد تھا

اس حقیقت سے ہر صاحبِ نظر واقف ہے کہ فکری راہنمائی اور عملی طریق کار دو الگ الگ شعبے ہیں۔ میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب العلم ہوں اور اپنی فکری راہنمائی اسی سرچشمۂ ہدایت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ قرآنی راہنمائی زندگی کی مستقل اقدار اور اصولی حدود کی شکل میں ملتی ہے۔ یہ اقدار اور حدود غیر متبدل ہیں۔ قرآن وہ طریقے متعین نہیں کرتا جن کے مطابق ان اقدار و اصول کو ایک نظام یا معاشرہ کے محسوس پیکر میں منتقل کیا جائے گا۔ یہ طریقے حالات کے تقاضے کے مطابق، ہر دَور (بلکہ ایک ہی دَور کے مختلف اوقات) میں مختلف ہوں گے اور عند الضرورت ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان طریقوں کو خود متعین نہیں کیا۔ یہ جو ہمارے ہاں، اسلامی نظام کے سمجھنے میں اس قدر الجھنیں

پیدا ہورہی ہیں' تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے' ان طریقوں کو بھی جو کسی زمانے میں' اس وقت کی ضروریات کے مطابق' حصولِ مقصد کے لئے وضع اور اختیار کئے گئے تھے' قرآنی اصول واقدار کی طرح غیر متبدل اور ابدی سمجھ رکھا ہے۔ وہ طریقے' اب زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے' اور ہمارا اقدامت پرست طبقہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو خلافِ اسلام قرار دے دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود اسلام کے متعلق یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ یہ کسی زمانے میں تو خوشگوار نتائج پیدا کر گیا تھا لیکن اب اس میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں' لہٰذا' ہمیں اس کے ساتھ چمٹے نہیں رہنا چاہئے۔ ایک قرآنی مفکر اس قسم کی غلطی نہیں کرتا۔ (یا یوں کہئے کہ اسے ایسی غلطی نہیں کرنی چاہئے)۔ وہ اپنے دَور کے مسائل پر غور کرتا اور ان کے متعلق جو قرآنی راہنمائی ملتی ہے' اسے فکری انداز سے قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور طریق کار ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے جو اس راہنمائی کے مطابق عملی عمارت استوار کرنا چاہیں۔ البتہ وہ اس باب میں اتنی احتیاط ضرور برتتا ہے کہ یہ دیکھے کہ جو عملی طریق اختیار کیا جائے وہ قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے۔

> انسانیت سازی درحقیقت قرآنی تعلیم کا مقصود ہے۔ اسی داخلی انقلاب سے وہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اتنے بڑے ایثار کے لئے بطیبِ خاطر تیار ہوسکتا ہے

یہ ہے وہ بنیادی حقیقت جسے نظر انداز کر دینے کا نتیجہ وہ اعتراض ہے جسے محترم تبصرہ نگار نے میری کتاب پر بھی وارد کیا ہے اور (دوسرے مقام پر) علامہ اقبالؒ پر بھی۔ ان کے متعلق بھی انہوں نے کہا ہے کہ اقبالؒ نے اپنے آپ کو فکری مباحث تک محدود رکھا اور حصولِ مقصد کے لئے عملی طریق کار تجویز نہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبالؒ کی دیدہ وری اور دورنگہی تھی جو انہوں نے ایک مفکر کے صحیح مقام اور منصب کو سمجھ لیا اور عملی طریق کار کو اس مردِ سیاستدان کے سپرد کر دیا جس کی فراست اور دیانت پر انہیں اعتماد تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں ایک آدھ مرتبہ عملی طریق تجویز کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اربابِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اس میں وہ اس مقام تک نہ پہنچ سکے جو بہ حیثیت مفکر انہیں حاصل تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے پھر اس کی کوشش نہیں کی۔ کلامِ اقبالؒ میں ان کی مثنوی —— پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق —— کو ایک خاص مقام حاصل ہے —— بہت بلند مقام —— اس مثنوی کے نام سے (جو ان کا اپنا تجویز کردہ ہے) واضح ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے عملی طریق کار کے تعین کی اہمیت کو محسوس کیا تھا لیکن اس باب میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ ان کی آزادانہ فکری تخلیق نہیں تھا' ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا اور اسی لئے اسے چنداں اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔ اُس زمانے میں مسٹر گاندھی کی سودیشی تحریک کا عام چرچا تھا۔ چنانچہ اقبالؒ نے بھی اپنی قوم سے کہا تو یہی کہ:

آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر — آں فروش وآں بپوش وآں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند — خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند

(مفہوم: اے آزاد انسان جو کچھ بھی تمہاری سرزمین کی خاک سے پیدا ہوتا ہے اُسی سے بنائی ہوئی اشیائے صرف کو استعمال میں لاؤ۔ یعنی غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ کرو کیونکہ جو لوگ خود آگاہ ہوتے ہیں وہ اپنی گدڑی خود ہی سیتے ہیں۔س۔ا)

اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ (اقبالؒ کو اپنا فکری مرشد تسلیم کرنے کے باوجود) قائدِ اعظمؒ کی عملی سیاست کی نگہ نتائج شناس نے طریق کار کے اس مشورہ کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور نہ اقبالؒ نے اس پر زور دیا —— قائداعظمؒ تو ایک طرف خود مسٹر گاندھی نے دو ہی قدم آگے جا کر اس طریق کو گردِ کارواں کی طرح پیچھے چھوڑ دیا تھا —— حتیٰ کہ اہمسا (عدم تشدد) کو بھی جو اس کے نزدیک اس کے (مذہب) دھرم کا جزو تھا —— عملی سیاست کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

اب آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت جب (صدرِ اوّل میں) پہلی بار عملاً متشکل ہوا تھا تو اس کی صورت کیا تھی۔

جب وہ اس کی صداقت کے متعلق، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کر لیا۔ اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضور ﷺ دعوت دیتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس زمانے میں وہی لوگ مسلمان کہلاتے تھے جو اپنے قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، اس نظام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔ جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرم ﷺ فرماتے تھے

لیکن اس سے پہلے، چند الفاظ میں اسے سمجھ لیجئے کہ اس نظام کی عمارت کس بنیاد پر استوار ہوئی تھی (اور استوار ہوگی)۔ وہ سنگِ تاسیس یہ تھا کہ

ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق، مفوضہ امور کو نہایت محنت اور جانفشانی سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے، بقدر اپنی ضرورت کے لے کر، باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ بلکہ بعض حالات میں، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھے اور اس کا نہ کسی سے اجر مانگے نہ معاوضہ۔ حتیٰ کہ کسی کے شکریہ تک کا بھی متمنی نہ ہو۔

یہ تھا اس نظام کا سنگ بنیاد جو اسلام کا مطمحِ نظر تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور، نہ صرف اس نظامِ سرمایہ داری کے خلاف تھا جو اس زمانے میں عام تھا، بلکہ انسان کی طبعی زندگی کے جبلی تقاضا (INSTINCT) کے بھی خلاف۔ انسان کی طبعی زندگی کا جبلی تقاضا، مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ اسے کسی دوسرے کے مفاد کی کوئی فکر اور پروا نہیں ہوتی۔ اس لئے جو تقاضا، قرآنی نظام کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے، وہ اسے اس کے جبلی تقاضوں سے بلند لے جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ (حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے) عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے خاص انداز کے انسان کی ضرورت ہے۔ اور انسانیت سازی

درحقیقت قرآنی تعلیم کا مقصود ہے۔ اسی داخلی انقلاب سے وہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اتنے بڑے ایثار کے لئے بطیبِ خاطر تیار ہوسکتا ہے۔ اس نظام کی تشکیل کے لئے جب نبیٔ اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا' تو اس وقت (حضور ﷺ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اس نظامِ نَو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پرسکون واطمینان سے غور وفکر کیا اور اس کے بعد' جب وہ اس کی صداقت کے متعلق' دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کرلیا۔ اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضور ﷺ دعوت دیتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس زمانے میں وہی لوگ مسلمان کہلاتے تھے جو اپنے قلب ودماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ' اس نظام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے' ان کی تعلیم وتربیت کا خصوصی انتظام خود نبیٔ اکرم ﷺ فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو حضور ﷺ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ: وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (3:164) تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضور ﷺ انہیں اس نظام کے قوانین وضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت وغایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ ''صلاحیتوں کی اس نشوونما'' سے مراد' صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں' اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوو ارتقاء بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت وکردار کی بلند وبالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابن آدم' حیوانی سطح سے بلند ہوکر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوجاتا ہے اور یہی چیز جذبۂ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جب ان میں سیرت وکردار کی اس قسم کی پاکیزگی اور پختگی پیدا ہوجاتی ہے' تو ان سے ایک عہد لیا جاتا ہے جو درحقیقت اسلامی نظامِ ربوبیت کی اساس ہے یعنی یہ عہد کہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (9:111)

یہ حقیقت ہے (یونہی ذہنی عقیدت مندی نہیں) کہ مومنین نے اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیئے ہیں اور خدا نے انہیں جنت کے عوض خرید لیا ہے۔

اسی جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ

(1) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر' برضا ورغبت' اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔

(2) ان کی تعلیم وتربیت خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب ونگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور

(3) انہوں نے اپنی جان اور مال اسی نظام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عملِ تزمیل 1؎ (جماعت سازی) میں بسر ہوگئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے ممبر بنے' ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سُست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضور ﷺ کی عمرِ رسالت صرف تیئس سال تھی اور آپ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تیئس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عملِ تزمیل میں صرف ہوگئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضور ﷺ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو ''بے عملی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک حضور ﷺ کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو ''بے عملی'' کا دَور کہلائے گی!

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار' جنگ وجدال' فتنہ وفساد' عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا' اور اس جماعتِ نَو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں' اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابلِ برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا' نہ لڑائی جھگڑا' نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا' نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا' نہ کسی سے بدمعاملگی کی' نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے' مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ لیکن فریق مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا' نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا' نہ کوئی سازش کی' نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضاء اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا' نہ خیانت کی۔

حضور ﷺ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو ''بے عملی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک حضور ﷺ کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو ''بے عملی'' کا دَور کہلائے گی!

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی —— ''مملکت قائم کی'' کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ

1؎ رسول اللہ ﷺ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش واحتیاط سے کام لے۔

اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خودبخود سمٹ کر آجاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55)

یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا —— ایمان —— یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم۔ اور اعمالِ صالحہ —— قرآنی اقدار واصول کے اندر رہتے ہوئے' موقعہ اور محل کے مطابق مناسب اقدامات۔ (واضح رہے کہ قرآن نے ''اعمالِ صالحہ'' پر اتنا زور دیا ہے لیکن ان اعمال کی کوئی جامع و مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ حتیٰ کہ اس نے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کو جماعت مومنین اور مملکت اسلامیہ کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے لیکن (بجز چند احکام) معروف ومنکر کی تفاصیل بھی خود متعین نہیں کیں۔

> تکلیفیں برداشت کرتے رہے' مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ لیکن فریق مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا' نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا' نہ کوئی سازش کی' نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضاء اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے

جب یہ جماعت صاحبِ اقتدار ہوگئی۔ یعنی وسائلِ رزق ان کے قبضہ میں آ گئے تو معاشرہ میں نظامِ ربوبیت خودبخود نافذ ہوگیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ یہ کاروان' مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد' اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اُس وقت نہ کسی نے یہ سوال اُٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے' اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے۔ نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی —— انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزلِ پر پہنچنے کے بعد' کسی کے دل میں یہ سوال نہ اُبھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا' سب کچھ دیکھ بھال' سوچ سمجھ کر' ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا —— اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم' کہ اس سوسائٹی کا مقصود ومنتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد' اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد' اپنے آپ کو' اُس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی' تو مقصد حاصل ہوگیا۔ یعنی اسلامی نظام قائم ہوگیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام وفروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت ومدافعت کے لئے مصروفِ جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ ''طریق''، جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول واقدار کو بہ دلائل وبراہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا' اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں' مناسب تعلیم وتربیت سے ان کی انسانی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا' یہی ہے وہ پروگرام جسے میں نے شروع میں انسانیت سازی سے تعبیر کیا ہے۔

اب آپ تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے اُلٹ کر، پاکستان کی طرف آ جایئے۔ یہاں ایک ایسی قوم بستی ہے جو مسلمان کے نام سے متعارف تو ہے لیکن

(1) ان میں سے نہ کسی نے، اسلام کو سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر، دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ، بطیبِ خاطر اختیار کیا ہے۔

(2) نہ ہی ان کے سامنے اسلام کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ہے۔

(3) نہ ہی انہیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ اور جو اسلام ان کے ہاں مروّج ہے، وہ، وہ مذہب ہے جو انفرادی اور گروہی مفادات کے تحفظ کے لئے ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔

کوئی اس باب میں (SERIOUS) نہیں کہ اس راہ گم کردہ قافلہ کے لئے منزل کا تعین اور راستے کی وضاحت کی جائے۔ حکومتیں آتی رہیں اور جاتی رہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ مملکت کا نام اسلامی رکھ کر اور آئین میں یہ شق داخل کر کے کہ ملک کا کوئی قانون اسلام (یا کتاب وسنت) کے خلاف نہیں ہوگا، مُلّا سے جان چھڑاؤ اور عوام میں سستی شہرت حاصل کرو

(4) نہ ہی (صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح) ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام ہوا ہے۔

(5) نہ ہی انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے، اپنی جان اور مال کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دینے کا معاہدہ کیا ہے۔ اور

(6) نہ ہی یہ مملکت انہیں، ان کے ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجہ میں ملی ہے۔

یہاں حالت یہ ہے کہ:

(1) یہ قوم، متفق علیہ طور پر اتنا بھی نہیں بتا سکتی کہ مسلمان کہتے کسے ہیں۔

(2) کوئی معاملہ پیش آئے۔ ایک گروہ اسے اسلامی قرار دیتا ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ کوئی اسے جائز ٹھہراتا ہے کوئی ناجائز، ذرا ذرا سی بات پر ان میں باہمی سر پھٹول ہوتی ہے۔ ان کی بیویوں پر طلاق پڑتی ہے، ان پر کفر کے فتوے صادر ہوتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جسے متنازعہ معاملات میں حکم تسلیم کیا جاتا ہو۔

اور تماشہ یہ کہ کوئی اس باب میں (SERIOUS) نہیں کہ اس راہ گم کردہ قافلہ کے لئے منزل کا تعین اور راستے کی وضاحت کی جائے۔ ایک طرف حکومتیں آتی رہیں اور جاتی رہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ مملکت کا نام اسلامی رکھ کر اور آئین میں یہ شق داخل کر کے کہ ملک کا کوئی قانون اسلام (یا کتاب وسنت) کے خلاف نہیں ہوگا، مُلّا سے جان چھڑاؤ اور عوام میں سستی شہرت حاصل کرو۔ دوسری طرف، اربابِ مذہب کی یہ کیفیت کہ اُن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے

اسلام کے لفظ کو اپنی مفاد پرستیوں کے لئے سپر بنا رکھا ہے اور کچھ وہ جو ''مذہبی علوم'' سے تو واقف ہیں لیکن اسلام کی حقیقت سے قطعاً نا آشنا ہیں اور نہ خود جہالت کی تاریکی سے نکلنا چاہتے ہیں' نہ اپنے معتقدین کو نکلنے دینا چاہتے ہیں۔ ان کے بعد ایک گروہ ایسا بھی ہے جو (مذکورہ بالا حالات سے متأثر ہو کر) اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے' اب یہ ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ یہ گروہ دل میں تو اس کا قائل ہے' لیکن معاشرتی دباؤ کے ماتحت اپنے اس عقیدہ کو اعلانیہ زبان تک لانے کی جرأت نہیں کرتا --- یہ حضرات' ڈرائنگ رومز میں بیٹھے' گھنٹوں ان خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اس کے بعد اُٹھ کر سیدھے ''داتا صاحب'' پہنچ جاتے ہیں۔

> اگر کسی نے پوچھنا ہے تو یہ پوچھے کہ (اقبالؔ کے الفاظ میں) اس ''مسلمانے نامسلماں'' کو ''مسلمان'' کس طرح بنایا جائے تا کہ اس کے بعد یہاں کا معاشرہ' قرآنی معاشرہ میں بدل جائے اور موجودہ غلط معاشی نظام کی جگہ نظامِ ربوبیت آ جائے۔ نظامِ ربوبیت' کوئی خود کار مشین نہیں' جسے کہیں سے امپورٹ کر کے یہاں نصب کر دیا جائے اور سوئچ دبا دینے سے وہ چلنے لگ جائے

یہ ہے یہاں کی مسلمان قوم اور یہ ہیں اس قوم اور ملک کے حالات! اور اس کے بعد مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ (تم نے قرآن پر غور و فکر کیا ہے) تم بتاؤ کہ (اس قوم میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر) یہاں قرآن کا معاشی نظام (نظامِ ربوبیت) کس طرح نافذ کیا جائے؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

اگر کسی نے پوچھنا ہے تو یہ پوچھے کہ (اقبالؔ کے الفاظ میں) اس ''مسلمانے نامسلماں'' کو ''مسلمان'' کس طرح بنایا جائے تا کہ اس کے بعد یہاں کا معاشرہ' قرآنی معاشرہ میں بدل جائے اور موجودہ غلط معاشی نظام کی جگہ نظامِ ربوبیت آ جائے۔ نظامِ ربوبیت' کوئی خود کار مشین نہیں' جسے کہیں سے امپورٹ کر کے یہاں نصب کر دیا جائے اور سوئچ دبا دینے سے وہ چلنے لگ جائے۔ نظامِ ربوبیت' دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی' اُمنگوں کے محسوس پیکر کا نام ہے اور یہ کسی ایسی قوم میں نفاذ پذیر نہیں ہوسکتا جس کے اعماقِ قلب میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو۔ ہم تو نسلی مسلمان ہیں۔ جو بدوؔ اسلامی مملکت کے قیام کے بعد (دل کی تبدیلی کے بغیر' کسی اور تقاضا سے) حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے' قرآن نے ان کے متعلق کہہ دیا تھا کہ ---قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط --- یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ۔ ان سے کہہ دو۔ لَّمْ تُؤْمِنُوْا۔ تم ایمان نہیں لائے۔ اس لئے ایسا مت کہو۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا --- تم صرف یہ کہو کہ ہم اس نظام کے سامنے جھک گئے ہیں۔ اس لئے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ط۔ ایمان ہنوز تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔ اس کے بعد' جب تمہاری مناسب تعلیم و تربیت ہو جائے گی اور تم' اپنے دل کی کامل رضامندی سے' اس نظام کی اطاعت کرو گے' تو پھر

تمہارے اندر وہ تبدیلی پیدا ہو جائے گی جسے ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے (49:14)۔

آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم مسلمان، اگر قلب و نگاہ کی تبدیلی سے مسلمان نہیں ہوئے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں موجودہ مسلمانوں کی قومی (اجتماعی) زندگی کو بیکار سمجھتا ہوں۔ بالکل نہیں۔ جب کوئی قوم، اقدار (یا آئیڈیالوجی) کے اشتراک کی بنا پر، اپنی اجتماعیت سے محروم ہو جائے لیکن وہ اس کے باوجود انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنا چاہے، تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی وجۂ تعارف کو اپنی اجتماعیت کی بنیاد قرار دے لے اور اس طرح اپنے افراد کو تنکوں کی طرح منتشر ہونے سے بچا لے۔ اس قسم کی اجتماعی زندگی، انفرادی زندگی سے بہر حال بہتر ہوتی ہے بشرطیکہ اس سے، دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات اور سلب و نہب کی ہوس نہ اُبھرے۔ میں نے، تقسیم ہند سے پہلے، مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے (اپنی بساط کے مطابق) جو کچھ کیا اس کا جذبۂ محرکہ یہ تھا کہ قوم کی اس ہیئت کو بہر حال قائم رکھا جائے تا کہ اس اجتماعیت سے اگر ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین حاصل ہو جائے تو اس میں قرآنی نظام کے قیام کا امکان ہو۔ ہندوستان کا ایک جزو رہتے ہوئے اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

> میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم مسلمان، اگر قلب و نگاہ کی تبدیلی سے مسلمان نہیں ہوئے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں موجودہ مسلمانوں کی قومی (اجتماعی) زندگی کو بیکار سمجھتا ہوں۔ بالکل نہیں

اور تقسیم ہند کے بعد، میں نے اس امکان کو مشہود بنانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ (جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے) اس ''مسلمانِ نامسلمانے'' کو مسلمان بنا دیا جائے ـــــ وہ مسلمان جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

''زباں'' سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

میں نے اس کے لئے، سنتِ رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں، طریقہ وہی اختیار کیا جسے حضور ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں اختیار فرمایا تھا۔ یعنی میں نے

(1) سب سے پہلے، اپنی قوم سے کہا کہ ہمارا مروّجہ اسلام، دین نہیں رہا، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اسے جب تک دین میں تبدیل نہیں کیا جائے گا، مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔ میں نے گذشتہ بیس بائیس سال میں جو ہزار ہا صفحات لکھے ہیں، تقریریں کی ہیں، درس دیئے ہیں، وہ سب اسی مقصد کے لئے تھے۔ میں نے پہلے دین اور مذہب میں فرق کر کے بتایا اور پھر مثبت طور پر دین کا قرآنی تصور قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی، جو اہم معاملہ قوم کے سامنے آیا، اس کے متعلق وضاحت سے بتایا کہ قرآن اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

(2) میں نے اربابِ بست وکشاد اور اصحابِ فکرونظر سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں سے (جیسے کچھ بھی ہیں) مملکتِ پاکستان کو محفوظ رکھنے اور مستحکم بنانے کا کام لیا جائے' لیکن ہماری نئی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے ان کے قلب ونگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہوجائے جسے ایمانؔ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ہوگی وہ قوم جسے صحیح معنوں میں ''ملتِ اسلامیہ'' کہہ کر پکارا جائے۔ اس ملت کے وجود میں آجانے سے اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے گا اور انہی کے قلوب سے ابھرنے والی امنگوں سے نظامِ ربوبیت قائم ہوگا۔ اس کے لئے عملی طریق کیا اختیار کیا جائے گا' اسے' وہ ملت' اس وقت کے حالات کے مطابق' خود طے کرلے گی۔

میں تو پوری کی پوری اُمتِ محمدیہ کو' دنیا کے جملہ غیر مسلموں (کفار) کے مقابلہ میں' ایک جماعت سمجھتا ہوں' اس لئے اس امت کے اندر' کا فرو مسلم کی تفریق کا تصور بھی میرے نزدیک معصیتِ کبریٰ اور جرمِ عظیم ہے

یہ ہے اسلامی نظام قائم کرنے کا وہ طریقہ جسے میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں اور جسے منہاجِ رسالت پر تدبر وتفکر کے بعد میں نے (اپنی استعداد کے مطابق) اختیار کر رکھا ہے' اس فرق کے ساتھ کہ حضور ﷺ نے تبلیغ دین کے ساتھ' ایک الگ جماعت (اُمت) کی تشکیل بھی فرمائی تھی اور میں نے الگ جماعت سازی سے سخت اجتناب کیا ہے اور اپنے آپ کو صرف ایک مبلغ کی حیثیت تک محدود رکھا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ایک رسولؑ اپنے پیغام کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس پیغام کی صداقت کو قبول کرلیتے ہیں انہیں' ان کو کفار سے الگ کرکے' ایک متمیز اُمت کی تشکیل کرتا ہے۔ لیکن میں تو پوری کی پوری اُمتِ محمدیہ کو' دنیا کے جملہ غیر مسلموں (کفار) کے مقابلہ میں' ایک جماعت سمجھتا ہوں' اس لئے اس امت کے اندر' کافرو مسلم کی تفریق کا تصور بھی میرے نزدیک معصیتِ کبریٰ اور جرمِ عظیم ہے۔ امتِ محمدیہ کے اندر کافرو مسلم کی تفریق تو ایک طرف' قرآنِ کریم' اس امت کے اندر فرقہ بندی کو بھی شرک قرار دیتا ہے (30:31)۔ اور رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا (6:160)۔ اس لئے میں ایک الگ جماعت بنانے کی جرأت کیسے کرسکتا ہوں۔ میں دین کے متعلق قرآنی تصورات کو عام کئے جارہا ہوں اور جو لوگ ان تصورات سے متفق ہوجاتے ہیں' ان سے کہتا ہوں کہ وہ بھی اسی طرح انہیں عام کرتے جائیں تاکہ ہماری پوری قوم کے سامنے دین کے صحیح تصورات آجائیں۔ اسی طرح جب میں' قوم کی نئی نسل کے لئے قرآنی تعلیم وتربیت پر زور دیتا ہوں اور اب خود ایک درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کو آگے بڑھا رہا ہوں' (افسوس کہ درس گاہ کا خواب کبھی پورا نہ ہوسکا۔ س۔ا) تو یہ بھی پوری قوم کے بچوں کے لئے کر رہا ہوں' کسی خاص گروہ یا پارٹی یا کسی خاص طبقہ کے بچوں کے لئے نہیں۔ میرا منصب مسلمانوں کے سامنے اس دینؔ کا صحیح تصور لانا ہے جس کی طرف نسبت سے وہ (اور ہم) اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ جب ان کے سامنے دینؔ کا تصور آجائے گا اور ان کے دل ودماغ میں قرآنی تبدیلی پیدا ہوجائے گی' تو وہ' موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کو قرآنی

نظام میں بدلنے کے لئے طریق کار خود تجویز کرلیں گے۔ یہ ہے میرا مشن۔

من از طریق نہ پرسم' رفیق می جویم　　　کہ گفتہ اند' نخستیں رفیق باز طریق!

(مفہوم: میں راستہ نہیں پوچھ رہا میں تو ہم راہی ڈھونڈ رہا ہوں ضرب المثل ہے کہ پہلے رفیق پھر راستہ! س۔ا)

اس سلسلہ میں مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے' اس سے تو ہم متفق ہیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے جو راستہ تم تجویز کرتے ہو وہ بہت لمبا ہے اور زمانہ آج بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس لئے یہ تو —— تا تریاق از عراق آوردہ شود' مار گزیدہ مردہ شود —— والا معاملہ ہے۔ اس کے لئے کوئی (SHORT-CUT) ہونا چاہئے۔

یہ اعتراض (بظاہر) بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اکثر عجلت پسند طبائع اس سے متاثر بھی ہو جاتی ہیں' لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآنِ کریم (یا اسوۂ رسول اللہ ﷺ) سے مجھے کوئی (SHORT CUT) ملتا نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے' قرآن کے تجویز کردہ راستے کی لمبائی اور رفتار کی (بظاہر) سُستی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی گراں قدر عمرِ رسالت کا قریب ساٹھ فیصد حصہ' مکی زندگی کے تبلیغی مرحلہ میں گزرا اور اس کا ماحصل چند سو نفوس سے زیادہ دنیا کے سامنے نہ آیا۔ اس کے بعد مدنی زندگی کا ابتدائی دَور بھی' مخالفتوں کے ہجوم کے مقابلہ اور مدافعت میں گزرا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس محنتِ شاقہ سے کاشت کردہ کھیتی کو اپنے سامنے برومند ہوتا دیکھنے کی آرزو خود حضور ﷺ کے دل میں بھی بیدار ہوتی لیکن بارگاہِ خداوندی سے جواب ملتا کہ: وَاِنۡ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ (13:40)۔ ''جو کچھ ان لوگوں سے کہا جاتا ہے اگر اس کا کچھ حصہ تیری زندگی میں سامنے آجائے' یا تو اس سے قبل ہی وفات پاجائے' تو اس سے تیرے پروگرام پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے چلا جا۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے اس کے محسوس نتائج کب سامنے آتے ہیں''۔ آپ نے غور فرمایا کہ داعیٔ انقلاب کی اس معصوم وحسین آرزو کے باوجود' کوئی چھوٹا متبادل راستہ تجویز نہیں کر دیا گیا۔ ''تبلیغ'' کا وہی طول طویل پروگرام برقرار رکھا گیا اور اسی پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہنے کی تاکید کی گئی۔ جب راستے کی طوالت کو حضور رسالت مآب ﷺ کے لئے بھی مختصر نہیں کیا گیا تو ہم آپ کس قطار شمار میں ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین اٹل ہیں اور ان میں کسی کی خاطر بھی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا' ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ اگر ہم نے قرآن کی متعین کردہ منزل تک پہنچنا ہے —— یعنی اپنے ہاں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ کرنا ہے تو اس کے لئے پروگرام بھی وہی اختیار کرنا ہوگا جسے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ یعنی قلب ونگاہ کی تبدیلی سے ''مسلمانِ نامسلمانے'' کو مسلمان بنانا' تاکہ وہ نظام اس کے ایمان واعمالِ صالح کے فطری نتیجہ کے طور پر متشکل ہو سکے۔ اس راستے کو قرآن نے العقبۃ سے تعبیر کیا ہے یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا —— پہاڑ کی گھاٹی پر تیز قدمی سے چڑھا جا ہی نہیں سکتا۔

ویسے اگر کوئی ہنگامی طور پر قرآن کے معاشی نظام کو یہاں نافذ کرنا چاہتا ہے' تو اسے حکومت قانوناً نافذ کر سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفاد پرست گروہ اسے جبر سے تعبیر کرے گا لیکن قانوناً اسے جبر نہیں کہا جا سکے گا۔ اس لئے کہ جب مسلمان' قرآن پر ایمان رکھنے کا اقرار کرتے ہیں تو قرآن کے کسی حکم کی اطاعت کو وہ جبر کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ لیکن یہ محض ایک ہنگامی اور وقتی تدبیر ہوگی۔ اسے نہ دوام وثبات حاصل ہو سکے گا اور نہ ہی دیانت دارانہ طور پر عمل ہوگا۔ دیانتدارانہ عمل اسی قانون پر ہو سکتا ہے جس کا تقاضا انسان کے دل سے اُبھرے۔ خارج سے وارد کردہ قوانین کی اطاعت طوعاً وکرہاً ہی کی جاتی ہے اور جن لوگوں کے مفاد پر اس سے زد پڑتی ہو' وہ ہر وقت اس سے گریز کی راہیں تلاش کرنے یا تراشنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اسے دوام وثبات اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جب یہ اس قوم کے ہاتھوں متشکل ہو جس کے قلب ودماغ میں وہ تبدیلی آ چکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس کا بھی انتظام رکھے کہ ان آنے والی نسلوں کی ذہنیت بھی قرآنی سانچوں میں ڈھلتی رہے (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) قرآنی نظامِ ربوبیت کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ:

> شاباش انقلاب لانے کے متمنی حضرات ذرا اتنا سوچیں کہ ہمارے پیشِ نظر تو قرآنی انقلاب ہے جو مظہر ہوتا ہے افرادِ قوم کے قلبی اور ذہنی انقلاب کا

ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق' مفوضہ کام کو پوری پوری محنت سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے۔ بلکہ ہنگامی اوقات میں' دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دے۔

آپ سوچئے کہ ایسا نظام جس کا سنگِ تاسیس یہ ہو' قلب ونگاہ کی تبدیلی کے بغیر کسی صورت میں قائم ودائم رہ سکتا ہے اور قلب ودماغ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تو یقیناً وقت لگے گا اور اس مدت کو ہمیں ہمت اور حوصلہ سے برداشت کرنا پڑے گا۔

لیکن اگر ہم اتنے لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے' تو پھر ہمیں قرآنی منزل کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہئے۔ سیدھے طور پر اپنی منزل آپ متعین کر لینی چاہئے اور اس تک پہنچنے کے راستے بھی خود ہی تجویز کر لینے چاہئیں۔ لیکن پھر دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم اس پر اسلام کا لیبل نہ لگائیں۔ میں نے ملک کے ذمہ دار حضرات سے شروع ہی میں کہا تھا کہ جب وہ اسلام' اسلام پکارتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ پہلے اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس سے مراد کیا ہے۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کریں کہ کیا اسلام کو نظامِ حیات بنانے کی ہم میں ہمت ہے۔ اگر ہے تو پھر کسی قسم کی مخالفت کی پروا کئے بغیر' اس راستے پر گامزن ہو جایئے۔ لیکن اگر وہ سمجھیں کہ اس قسم کے نظام کا قیام ان کے بس کی بات نہیں' تو وہ کھلے بندوں اس کا اقرار کر کے' دیگر اقوامِ عالم کی طرح اپنے ہاں سیکولر نظام رائج کر لیں۔ اس سے وہ اگر مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکیں گے تو انہیں کم از کم مقامِ آدمیت تو نصیب

ہو جائے گا۔ لیکن انہیں، نہ اس نظام کے قیام کی ہمت ہوئی نہ اس اقرار کی جرأت۔ نتیجہ اس کا وہ منافقت ہے جو اب قوم کے بیشتر حصہ کا شعار بن چکی ہے اور جس سے ہم جہنم کے ''اسفل'' میں پہنچ چکے ہیں۔

شتاب انقلاب لانے کے متمنی حضرات ذرا اتنا سوچیں کہ ہمارے پیش نظر تو قرآنی انقلاب ہے جو مظہر ہوتا ہے افرادِ قوم کے قلبی اور ذہنی انقلاب کا۔ اگر ہم ان تحریکوں کی تاریخ پر بھی غور کریں جو معاشرہ کی کسی ایک شق میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے وجود میں آئی تھیں تو ہم دیکھیں گے کہ انہیں ابھی اپنے نظریات کی تبلیغ اور ان کے مطابق ذہنیتوں میں تبدیلی کے لئے سالہا سال (بلکہ بعض اوقات صدیوں تک) کا عرصہ لگ گیا اور اس کے بعد جا کر کہیں ذرا سی تبدیلی ہو سکی۔ سطح بین نگاہیں ان تحریکوں کا مشاہدہ اس وقت کرتی ہیں جب وہ نظری انقلاب کی طول طویل مسافت طے کر چکنے کے بعد، ظہورِ نتائج کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہیں، اس لئے وہ سمجھتی ہیں کہ انقلاب شتاب آ جاتا ہے۔ یہ ان کی نگاہ کی بھول ہوتی ہے۔ انہیں کیا علم کہ قطرے کو گہر ہونے تک کس کس قسم کے ''حلقۂ صد کامِ نہنگ'' سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے　　حالتیں کتنی گزر جاتی ہیں پروانے پر

ان تحریکوں کی نقالی کرنے والے بھی، اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ تحریک کی صدیوں پر پھیلی ہوئی نہایت صبر آزما اور ہمت طلب لیکن خاموش و پرسکوت مسافت سے صرفِ نظر کر کے، آغازِ کار اس مرحلہ سے کر دیتے ہیں جہاں اس تحریک کی نمود محسوس پیکروں میں ہوئی تھی۔ نتیجہ اس کا انقلاب نہیں فساد ہوتا ہے — یعنی تخریب بلا تعمیر!

قرآن، مستقل اقدار کی رُو سے انقلاب کا پیامبر ہے اور فساد کو بدترین جرم قرار دیتا ہے اور اس قسم کے انقلاب کے لئے وہ دل اور دماغ دونوں کے انقلاب کو شرطِ لاینفک قرار دیتا ہے خواہ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے۔

اور قرآن کے اسی انقلاب کا میں مبلغ ہوں اور اس کے لئے اُسی کے تجویز کردہ راستہ پر گامزن — جو احباب مجھ سے کسی اور طریق کے متقاضی اور متمنی ہیں، میں ان کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

زما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی!

(مفہوم: تُو مُجھ سے دیکھنے والی نگاہ حاصل کر۔ کیمیا گری کے نسخے کیوں تلاش کرتا ہے۔ س۔ا)

بعض احباب کہتے ہیں کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے، وہ بھی درست ہے اور اس تک پہنچنے کا جو طریق تم تجویز کرتے ہو ہمیں اس سے بھی اتفاق ہے، لیکن تم نے اپنا مخاطب تعلیم یافتہ (INTELLECTUALS) عوام کا طبقہ قرار دے رکھا ہے حالانکہ موجودہ غلط معاشرہ میں سب سے بری حالت عوام کی ہے، اس لئے تمہیں چاہئے کہ عوام (MASSES) میں جا کر اپنے پیغام کی تبلیغ کرو۔ انقلاب عوام کے لانے سے آئے گا۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ قرآنی انقلاب عوام کے لانے سے آتا ہے یا اربابِ فکر و نظر کے قلب

ودماغ میں تبدیلی پیدا کرنے سے۔ میں ان حضرات سے، جو سمجھتے ہیں کہ اصل کام کرنے کا میدان عوام کا طبقہ ہے، عرض کروں گا کہ جب بات آپ کے سامنے اس قدر واضح طور پر آ چکی ہے تو پھر آپ اُٹھ کر اس کے مطابق کام کیوں نہیں کرتے؟ آپ مجھ سے تقاضا کیوں کرتے ہیں کہ میں اپنا اختیار کردہ پروگرام ترک کر کے، اس پروگرام کو اختیار کروں جسے آپ بہتر قرار دیتے ہیں۔ ایک مامور من اللہ (رسول) کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا کسی متبادل راستے کو اختیار نہیں کر سکتا لیکن میں تو نہ مامور من اللہ ہوں اور نہ ہی میں نے اس انقلاب آفرینی کا اجارہ لے رکھا ہے۔ میں نے بطیب خاطر، اپنے لئے زندگی کا ایک مشن تجویز کر رکھا ہے اور اسی پر میں گامزن ہوں۔ جو احباب میرے اس مشن کے ساتھ اتفاق کر کے میرے رفیق سفر بنتے ہیں، میں ان کی رفاقت کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں، جنہیں اس سے اختلاف ہوتا ہے، ان سے بصد معذرت عرض کر دیتا ہوں کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے لئے جونسا راستہ بہتر خیال کریں اسے اختیار کر لیں۔ اب آپ سوچئے کہ جو حضرات اس کے باوجود یہ اعتراض کئے جائیں کہ تم ہمارا تجویز کردہ راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، میں انہیں کیا جواب دوں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے اور دوسروں کی تنقیص و تنکیر سے اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ کام کرنے والا اگر کسی راستے کو غلط سمجھتا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور دوسروں کے پروگرام میں نقص نکال کر عمر بھر یہ شکایت کرتا رہے کہ وہ اس کے تجویز کردہ راستے کو کیوں اختیار نہیں کرتے۔

یہ ہے میرا مسلک، جس پر میں کاربند چلا آ رہا ہوں اور کاربند رہنا چاہتا ہوں کیونکہ میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔ والسلام!

پرویزؔ

بندۂ ظفریاب

ہماری قرآنی تحریک کے اس سفر میں ہمارے ساتھ شامل ایک فرد جو کہ اچانک ہم سے جدا ہو گیا۔ جدا بھی کچھ اس طرح کہ بس بہت ہی اچانک۔ یہ بندۂ خدا اپنے دائرہ فرائض کے اندر انتہائی محنتی، چست اور چاق و چوبند کردار کا حامل، ہر ایک کے ساتھ پیار و محبت اور خلوص سے پیش آنے والا ہمارا ہم سفر اور ہم رکاب ادارہ کے محترم احباب کے حلقہ میں سب کا ہر دل عزیز اور ماتھے کا جھومر ظفر اقبال تھا جو اب ہم میں نہیں رہا۔

اس کے یوں چلے جانے سے ہر دل حقیقتاً بہت مغموم اور رنجیدہ ہے، ہمیشہ یاد رہے گا۔ اللہ پاک اُس کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو اس صدمہ کو برداشت کرنے کی مطلوب ہمت سے نوازے (آمین ثم آمین)

مغموم اور دعا گو: امجد محمود بزم راولپنڈی

محمد سلیم اختر

اقبالؒ اور پرویزؒ

پرویزؒ صاحب کی تمام کتابوں اور تحریروں کو اگر اقبالیاتِ پرویز کا نام دے دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اقبالؒ کی شاعری پر ان کے لیکچرز تو اور بھی خاصے کی چیز ہیں۔ زبان و بیانِ پرویز اور زیرِ درس اقبالؒ کے اشعار ہوں تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ اور پرویزؒ کے موضوع پر خود پرویز صاحب کی تحریروں کے اقتباسات پیش کر دیے جائیں تو غیر موزوں نہ ہوگا۔ ذیل میں کچھ اقتباسات پیشِ خدمت کئے جا رہے ہیں جو متعدد کتابوں اور مقالوں میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں' ان اقتباسات سے ان دونوں عظیم شخصیات کے باہمی تعلقات کا ایک واضح خاکہ سامنے آ جائے گا۔

علامہ اقبالؒ سے پرویزؒ صاحب کا ابتدائی تعارف:

پرویز صاحب نے اپنی تصنیف ''تصوف کی حقیقت'' میں اقبال سے اپنے ابتدائی تعارف کی کہانی کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

> مجھ پر مبداءِ فیض کی ایک اور نگۂ تلطف یہ تھی کہ دادا جانؒ بڑے وسیع المشرب اور کشادہ نگاہ واقع ہوئے تھے۔ اس کا مجھے کس طرح فائدہ پہنچا' اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ جب علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی تو اہلِ تصوف کی طرف سے اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا گیا' کیونکہ اس میں مسلکِ وحدت الوجود پر بالعموم اور حافظؒ پر بالخصوص کڑی تنقید کی گئی تھی۔ (اس معرکہ کا تفصیلی ذکر آپ کو متنِ کتاب میں ملے گا)۔ دادا جانؒ خود وحدت الوجودی اور حافظؒ کے مداح تھے۔ اس اعتبار سے انہیں ان کا ساتھ دینا چاہئے تھا جو اقبالؒ کے خلاف ہنگامے برپا کر رہے تھے۔ لیکن انہوں نے' نہ صرف یہ کہ ایسا نہیں کیا بلکہ اپنی وسعتِ قلب کا ایک اور انداز سے ثبوت دیا۔ انہوں نے مثنوی اسرارِ خودی کو سبقاً سبقاً مجھے خود پڑھایا' اور اس انداز سے کہ حضرت علامہؒ کی علمی عظمت اور احترام میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ یہ اقبالؒ کے ساتھ میرا پہلا قلبی تعارف تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اگر وہ مجھے مسلکی تعصب کی تنگ نگہی کے ساتھ مثنوی پڑھاتے تو (اس شاخِ سرسبز کی سی عمر میں) میرے قلب کی گہرائیوں میں علامہ اقبالؒ کا کس قسم کا تصور جاگزیں ہوتا اور میں زندگی کی کتنی بڑی عظیم اور بے بہا متاع سے محروم رہ جاتا! اتنا ہی نہیں! دادا جانؒ نے میری نگاہ کا رُخ کس طرح دانشکدۂ اقبالؒ کی طرف موڑ دیا' اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔

ایسا نظر آتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے ساتھ ان کے روابط تھے' یا وہ (کم از کم) باہمدگر متعارف تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ دادا جانؒ نے مثنوی کے جس نسخہ کو مجھے پڑھایا تھا' اس پر حضرت علامہ کے دستخط ثبت تھے۔ بہر حال' حقیقت کچھ بھی ہو' علامہ اقبالؒ کا ابتدائی نقش جو میرے قلب و دماغ پر مرتسم ہوا' اس نے میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔

لیکن میں نے ابھی تک فطرت کی اس منفرد نوازش کا ذکر نہیں کیا جس نے مجھے وہ کچھ بنا دیا جو کچھ میں اب ہوں۔ یعنی آفتابِ قرآنی کے ساتھ نسبت رکھنے والا ایک ذرۂ خاک۔۔۔ اور اس پر میں جس قدر بھی فخر و ناز کروں' کم ہے۔ وہ نوازشِ خصوصی یہ تھی کہ مجھے تنقیدی نگاہ بھی عطا کر دی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میں کسی بات کو اس وقت تک تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تھا جب تک میرا قلب و دماغ مطمئن نہ ہو جائے۔ تنقیدی نگاہ کے نشتر کی خلش کا سلسلہ اسی زمانہ میں شروع ہو گیا اور دلائل طلبی گویا میرا علمی معمول بن گیا تھا۔

(تصوف کی حقیقت' باب رسم و رہ منزلہا' صفحات' غ۔ف)

پرویزؒ صاحب کی علامہ اقبالؒ سے ملاقاتیں:

''جب میں لاہور آنے لگا تو دادا جانؒ نے مجھے (لاہور میں) ''دو بزرگوں'' سے ملنے کی تاکید فرمائی۔ ایک امام الدین نجار جو نواں کوٹ کے گاؤں میں رہتے تھے (اور کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں) اور دوسرے علامہ اقبالؒ جن سے انہوں نے مجھے' ذہنی طور پر پہلے متعارف کرا رکھا تھا۔ اول الذکر بزرگوار سے تو میں ایک آدھ مرتبہ ہی ملا' لیکن حضرت علامہؒ کی خدمت میں باز یابی کے مواقع زیادہ حاصل ہوئے' اب جو اس زمانے میں ان کی خدمت میں حاضری کی جرأت پر نگۂ بازگشت ڈالتا ہوں تو دل ہی دل میں محجوب سا ہو جاتا ہوں۔ کہاں علامہ اقبالؒ اور کہاں ایک اٹھارہ بیس سال کا نو وارد' گمنام سا طالب علم! چہ نسبت خاک را با عالم پاک! لیکن حضرت علامہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کسی ملنے والے کے دل میں اپنی بلندئ مقام کا احساس نہیں پیدا ہونے دیا کرتے تھے۔ وہ بہت جلد اس کے ''یار'' بن جایا کرتے اور یوں بعدِ مرتبت کا احساس مٹا دیا کرتے تھے۔

جہاں تک امورِ شریعت کا تعلق ہے' میں نے حضرت علامہ سے قرآن فہمی کا طریق اخذ کر لیا۔ اس کے بعد میں قرآن اور دین کے سلسلے میں جو کچھ کر سکا ہوں' وہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ مجھ ذرۂ ناچیز پر ان کا یہ اتنا بڑا احسان ہے جس سے میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔''

(ایضاً۔ صفحات' ق۔ک)

ماہنامہ طلوعِ اسلام، قائداعظمؒ اور اقبالؒ:

محمد عمر دراز صاحب ''مجلسِ اقبال'' کے آغازِ سخن میں چوہدری حبیب الرحمن کی کتاب ''اقبالؒ قائداعظمؒ پرویزؒ مودودی اور تحریکِ پاکستان'' کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں:

حضرت قائداعظمؒ نے جب حصولِ پاکستان کے لئے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو انہیں، خلافِ توقع ایک ایسے محاذ پر بھی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا جو ان کے اپنے (سیاسی) دائرہ عمل سے باہر تھا۔ یہ مخالفت تھی ان مسلمان نیشنلسٹ علماء کی طرف سے جو ہندو کانگرس کی وظیفہ خوری میں، اپنی قوم کی تمام تر متاع، ہندو کے ہاتھ بیچ ڈالنے کے درپے تھے۔ قائداعظمؒ نے، تحریک پاکستان کی اس محاذ سے مخالفت کے سدباب کی ذمہ داری جناب غلام احمد پرویزؒ کے سپرد کی۔ میاں بشیر احمد صاحب نے بتایا کہ قائداعظمؒ کے اس انتخاب کے محرک علامہ اقبالؒ تھے۔ آپ نے پرویز صاحب کا نام اپنے مذکورہ باہمی تعلقات اور پرویزؒ صاحب کی فہم قرآن سے متعلق اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر تجویز کیا تھا۔ چنانچہ قائداعظمؒ کی تفویض کردہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے 1938ء میں ماہنامہ طلوع اسلام کا دہلی سے آغاز نو ہوا۔ اس زمانے کی طلوع اسلام کی فائلیں اس پر شاہد ہیں کہ پرویزؒ صاحب نے کس مہارت اور جانفشانی سے مجوزہ مملکت پاکستان کی دینی اہمیت اور اس کے حصول کی ضرورت کو قوم کے سامنے پیش کیا۔ حضرت قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء کی کوششوں کو بارگاہ ایزدی سے شرف پذیرائی ملا اور 14 اگست 1947ء کو نئی مملکت پاکستان دنیا کے نقشہ پر ابھری جبکہ مخالفین پاکستان کے حصہ میں روسیاہی، ندامت اور شکست کے سوا اور کچھ نہ آیا۔ پرویزؒ صاحب کی یہ مساعیٔ جمیلہ اب ''تحریک پاکستان اور پرویز'' نامی کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مزید برآں پرویز صاحب کی تحریک حصول پاکستان کے سلسلہ میں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انہیں حکومت کی طرف سے ''تحریک پاکستان گولڈ میڈل'' بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ ہے علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے پرویزؒ صاحب کے تعلقات اور تحریک پاکستان میں ان کی قومی خدمات کی ایک ہلکی سی جھلک۔

(مجلسِ اقبال از پرویز، صفحات، ط۔ظ)

علامہ اقبالؒ سے پرویزؒ صاحب کی آخری ملاقات:

اس ملاقات (جنوری 1938ء) کا احوال پرویزؒ صاحب نے خود اپنے قلم سے تفصیلاً تحریر کیا ہے جو کہ ان کی تصنیف ''اقبالؒ اور قرآن'' میں شامل ہے اس موقعہ پر انہوں نے اقبالؒ سے ان کی تصنیف ''جاوید نامہ'' سے متعلق بھی گفتگو کی۔ اس گفتگو کا ایک اقتباس ذیل میں درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

جاوید نامہ کے متعلق کچھ ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ دربارِ فرعون کے ساحر جن کی قوتِ ایمانی استبدادِ فرعون

کا دندان شکن جواب ہے، انہیں جاوید نامہ میں ضرور جگہ ملنی چاہئے تھی۔ فرمایا کہ جاوید نامہ میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سید احمدؒ (بریلوی) اور سید احمد (دہلوی)، (سرسید) کی روحوں کو بھی اکٹھا کر دوں۔ یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور بھی بہت سی باتیں میں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں۔ اب کسی اور موقع پر ان کو لکھوں گا۔ (اقبال اور قرآن، صفحات: 99-98)

''تبویب القرآن'' کی ترتیب میں اقبالؒ کی راہنمائی:

لغات القرآن کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

میں قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ میری زندگی، بچپن سے لے کر اس وقت تک، اس کتاب عظیم کے ساتھ متمسک رہی ہے۔ ابتداءً میں نے بھی (جیسا کہ ہمارے ہاں کا معمول ہے) اس کا مطالعہ تقلیدی اور رواجی انداز سے کیا لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ بعد میں جب میرے شعور میں انقلاب آیا اور میں نے ان راستوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ

منزل و مقصود قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

یہ میرے بخت کی یاوری تھی کہ عین اس وقت جب میں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی سے (من جملہ دیگر امور) یہ اہم نکتہ میری سمجھ میں آیا کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

''تصریف آیات'' کی رو سے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تبویب القرآن کی ضرورت تھی۔ یعنی ایک موضوع سے متعلق، قرآن کریم کی تمام آیات کو یکجا کر کے انہیں مربوط مضمون کی شکل میں مرتب کرنا۔ اگرچہ تبویب القرآن کے متعلق اس سے پہلے بھی کوششیں ہوئی تھیں لیکن جو خاکہ علامہ اقبالؒ کے پیش نظر تھا، اور جس کی تفصیل انہوں نے مجھے بتائی تھی، اس کے مطابق کوئی کتاب مجھے نہ مل سکی۔ اس کے لئے ایک نئی کتاب کی تدوین کی ضرورت تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کوئی جماعت، یا مجھ سے زیادہ موزوں فرد اس اہم کام کے لئے تیار ہو جائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور بالآخر یہ اہم کام مجھے خود ہی کرنا پڑا۔ اس کے لئے میں نے سینکڑوں عنوانات کے ماتحت قرآنی آیات کی تبویب (Classification) کی۔

(لغات القرآن، پیش لفظ، صفحات: 20-19)

مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ:

اس مجلس کا احوال پرویزؒ صاحب کے رفیقِ قدیم خورشید عالم صاحب نے دسمبر 1954ء میں تفصیل سے قلم بند کیا جو کہ

ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہوا:

1951ء میں، مصر کے نامور دانشور، صاحبِ قلم اور کلامِ اقبال کے شیدائی، ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ مملکتِ مصر کے نئے سفیر کی حیثیت میں پاکستان تشریف لائے۔ اس سے پہلے آپ فرانس میں یہ فرائض ادا کر رہے تھے، جہاں انہوں نے اقبالؒ کے ''پیامِ مشرق'' کا منظوم عربی ترجمہ کیا تھا۔ قیام فرانس کے دوران کسی تقریب میں آپ کو کسی نے بتایا کہ اگر آپ کلام اقبال سے کماحقہٗ استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو پاکستان جایئے۔ وہاں آپ کو ایک پاکستانی اقبال شناس، کلام اقبال کی حقیقی روح سے روشناس کرائے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب، اس وقت کے فرمانروائے مصر، شاہ فاروق سے اپنی خصوصی درخواست پر پاکستان کے لئے سفارت حاصل کر کے یہاں آئے اور سید عبدالواحد صاحب (سیکرٹری مجلس اقبال) کے توسط سے آپ نے پرویزؒ صاحب سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ پرویزؒ صاحب سفارت خانہ مصر گئے تو اپنے ذہن میں ایک عجیب سا تصور لے کر۔ وہ کہتے ہیں کہ ''سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے۔ شان و شوکت، ٹھاٹھ باٹھ، تصنع، تکلف، ظاہر داری اور دیگر بے شمار بظاہر حسین لیکن بباطن خبیث دخترانِ ماڈرن ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو ''سود و سودائے مکر و فن'' سے معمور ہے، نہ کہ ''سوز و مستی جذب و شوق'' سے آباد من کی دنیا۔ اس جہانِ گندم و جو میں ان درویشوں کا ذکر کہاں جن کے قلوب واذہان میں ''قرآن اور اقبال'' نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطرابِ موج کے ساتھ ساتھ، سکونِ گہر بھی ہو، جو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں اور جن کی حالت یہ ہو کہ:

ز برونِ در گذشتم، ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

بہر حال پرویزؒ صاحب سفارت خانہ مصر گئے، اس حال میں کہ آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔ سفیرِ مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویز صاحب نے یہ محسوس کیا کہ وہ کاخِ نمائندہ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں۔ وہ درویشِ خدا مست، نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایک طرف ان کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا۔ اس میں سراسر طالب علمانہ تجسس تھا۔ دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انہیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبال ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویز اور عزام اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے ''من تو شُدم، تو من شُدی'' کی حقیقی اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ (8:63) کی تصویر بن جاتے ہیں۔ یہ ملاقات مجلسِ قلندرانِ اقبال کا نقشِ اول بنی۔

چنانچہ مجلسِ قلندرانِ اقبال کی تاسیس ہوئی اور سفارت خانہ مصر میں اس کی نشستوں میں ضربِ کلیم، بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز (حصہ اردو)۔ جاوید نامہ، اسرار و رموز، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق اور بانگِ درا لفظاً لفظاً پڑھی گئیں اور ان کی تشریح کی گئی۔ سفیرِ اقبال ڈاکٹر عزام نے ان شرحوں کو منظوم عربی کا پیرہن دیا اور پوری دنیائے عرب کو فکر اقبال کے نور سے منور کر دیا۔ انہوں نے علامہ اقبال کے عرب دنیا میں تعارف کی غرض سے ایک خود مکتفی کتاب بعنوان ''محمد اقبال۔ سیرتہ، شعرہ، وفلسفتہ' بھی تالیف کی۔

ان مجالس میں ظاہر ہے کہ شیخ قلندراں کا منصب پرویز صاحب ہی کے لئے مختص تھا کیونکہ کلامِ اقبال وہی پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے۔ ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ کا تعارف بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے پرویز صاحب ہی سے لکھوایا، جواب (ترجمہ اردو) پرویز صاحب کی تصنیف ''اقبال اور قرآن'' جلد اول میں شامل ہے۔

یہ سلسلہ 4 سال تک جاری رہا اور اس مجلس کی آخری نشست 11 دسمبر 1954ء کو منعقد ہوئی جس میں مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، کا آخری باب زیر مطالعہ رہا۔ اس کے بعد سفیر اقبال، پاکستان سے رخصت ہو کر سعودی عرب چلے گئے۔

1955ء میں بعض احباب کی طرف سے تقاضے موصول ہونا شروع ہوئے کہ طلوع اسلام میں پیغامِ اقبال کو عمومی طور پر پیش کرنے کے علاوہ، اس میں کلام اقبال کی تشریح مسلسل اور التزاماً شائع ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس کے لئے سب سے پہلے مثنوی اسرار و رموز کا انتخاب کیا گیا کہ حضرت علامہ کی پہلی مطبوعہ کتاب بھی یہی تھی۔ 1955ء سے 1959ء تک اس مثنوی کی شرح طلوع اسلام میں شائع ہوتی رہی، جو اب کتابی شکل میں شائع کی جا چکی ہے۔

(خورشید عالم، ماہنامہ طلوع اسلام، دسمبر 1954ء)

اقبالؒ اور نقدِ پرویزؒ:

اس سب کے باوجود پرویز صاحب نے جہاں جہاں اقبال کے افکار کو اپنی رائے میں قرآن کے مطابق نہیں پایا، نہایت غیر جانب داری سے تنقید کی ہے۔ وہ خود تصوف کی حقیقت میں تحریر فرماتے ہیں:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

''اپنوں کی خفگی'' کی وجہ میری وہ تنقید ہو گی جو میں نے خود علامہ اقبالؒ کے بعض عقائد اور خیالات پر کی ہے۔ اقبالیئین کا حلقہ تو میرے اپنوں کا حلقہ ہے۔ ان میں اکثریت ان کی ہے جو خود میری تحریروں کی وجہ

سے فکرِ اقبالؒ کے قریب آئے ہیں۔ (اس نکتہ کی مزید تشریح اس کتاب کے حصہٴ دوم میں ملے گی جو ''اقبالؒ اور تصوف'' سے متعلق ہے)۔

جہاں تک مخالفت کا تعلق ہے میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری تنقید اصولوں پر مبنی ہے۔ اس سے کسی واجب الاحترام شخصیت کی تنقیص یا تحقیر مقصود نہیں۔ میں تو (قرآن کی رو سے) غیر مذاہب کے مذہبی بزرگوں کی تحقیر بھی روا نہیں رکھ سکتا چہ جائیکہ خود اپنے ہاں کے بزرگوں کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخی کا مرتکب ہوں۔ کسی کی غلط بات کو غلط کہنے کو اس کے خلاف گستاخی پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں تو اس اسوۂ ابراہیمیؑ کے اتباع کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے جس کی رو سے اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا یَسۡمَعُ وَلَا یُبۡصِرُ وَلَا یُغۡنِیۡ عَنۡكَ شَیۡـًٔا (19:42) انہوں نے اپنے والد تک کو معبودانِ باطل کی عبودیت سے روک اور ٹوک دیا تھا لیکن اس کے باوجود اسی والد کے ساتھ حسن سلوک کے جذبہ میں فرق نہیں آیا تھا۔ یہ اسی جذبہ کا تقاضا تھا جو وہ دعا کرتے رہے کہ اسے (والد کو) صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق عطا ہو جائے (القرآن۔ 114:9) اپنی ملت کے بزرگوں کے متعلق میرا مسلک بھی یہی ہے۔ میری تنقید ان کے غیر قرآنی عقائد کے خلاف ہے، ان کی ذات کے خلاف نہیں۔

تحریک پاکستان گولڈ میڈل:

شعبہ تحریک پاکستان، محکمہ اطلاعات وثقافت، حکومتِ پنجاب کی جانب سے کارکنانِ تحریکِ پاکستان کی لائق تقلید و صد تحسین خدمات کے تذکار جمیلہ پر مشتمل ایک کتاب شائع کی گئی جس کی مجلس ادارت میں پروفیسر محمد مظفر مرزا، شہباز بخت اور اشفاق ملک شامل تھے۔ اس کتاب میں پرویزؒ صاحب کا تعارف اس طرح درج ہے:

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی تاریخ پیدائش 9/جولائی 1903ء ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مرکزی حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ مرکزی حکومت پاکستان میں منتقل ہو گئے اور 1955ء میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

شیدائیٴ اقبالؒ ہونے کے ناطے آپ 1930ء سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے اس تصور کو آگے بڑھاتے رہے جسے حضرت علامہ اقبالؒ نے الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا تھا۔

1937ء کے موسم گرما میں، علامہ اقبالؒ کے ایماء پر حضرت قائداعظمؒ نے اپنے قیامِ شملہ کے دوران علامہ پرویز کو بلا کر فرمایا کہ یہ مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اس کی مدافعت کے محاذ کو میں تمھارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت قائداعظمؒ کی ہدایت پر وہ تمام ضروری

اقدامات کئے گئے جن کے نتیجہ کے طور پر ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے دورِ جدید کا اجراء' مئی 1938ء کے شمارے کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس ماہنامہ میں پرویز صاحب نے قرآن کریم کے عطا فرمودہ ''دوقومی نظریہ''، اسلامی مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر گرانقدر مقالات لکھے۔ اس دوران کانگرسی اور نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا رہا' اس کا آپ نے موثر دفاع کیا۔

علامہ موصوف اس وقت سرکاری ملازمت میں تھے' اس لئے مسلم لیگ کے سٹیج سے بات کرنا تو ان کے لئے دشوار تھا تاہم دہلی اور اس کے گردونواح کے ایسے تمام شہروں میں جہاں شام کو جا کر اگلے روز علی الصبح واپس آیا جا سکے' مسلم لیگ کے شبانہ جلسوں کے فوراً بعد اسی سٹیج سے بزمِ اقبال کی محفل آراستہ کی جاتی جس میں پرویز صاحب قرآن کریم اور فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں تحریک پاکستان اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے تصور کو واضح طور پر قوم کے سامنے پیش کرتے۔

یہ عملی جدوجہد قیامِ پاکستان تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ جب 1946ء میں سرخ پوشوں اور کانگرس کی ملی بھگت سے مسلم اکثریت کے صوبہ سرحد میں' پاکستان میں شمولیت/عدم شمولیت کے سوال پر ریفرنڈم کرانا طے پایا گیا تو پرویز صاحب صوبہ سرحد میں تشریف لے گئے اور اس وقت کے سرحد مسلم لیگ کے صوبائی صدر خان بخت جمال خان اور ان کے رفقاء کی معاونت سے صوبہ کی کانگرسی وزارت اور سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان کو ہمہ جہت مخالفتوں کے علی الرغم سرحد کے مسلم عوام کا فیصلہ کن ووٹ پاکستان کے حق میں ڈلوانے میں کامیاب ہوئے۔

علامہ پرویز 38-1937ء سے حضرت قائداعظم علیہ الرحمتہ کے' تحریک پاکستان کی دینی اساس کے موضوع پر ذاتی مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہی وہ واحد شخصیت تھی جنہیں حضرت قائداعظمؒ سے پیشگی وقت لئے بغیر ان کی خدمت میں' کسی وقت بھی باریابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ قائداعظمؒ نے قرآنی ہدایات سامنے آجانے کے بعد ہمیشہ انہی کے مطابق عمل کیا۔ پرویز صاحب ان معدودے چند دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے بقول پیر علی محمد راشدی' پاکستان کی سکیم کی تیاری میں مدد کی تھی۔

حضرت قائداعظمؒ علامہ پرویز پر غایت اعتماد رکھتے تھے اور ان کی رائے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ جب اس کا وقت آیا تو ان سے پاکستان کے سیکرٹریٹ کے لئے مناسب افسروں کے انتخاب کے لئے سفارش طلب کی۔

قیام پاکستان کے بعد اپنی وفات تک جب کسی دریدہ دہن نے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ یا ان کے رفقاء کے خلاف ہرزہ سرائی کی ناپاک کوشش کی تو یہی مردِ مجاہد آڑے آیا اور ہر موقع پر ایسے مدلل مقالات سپردِ قلم کئے جن سے تحریک پاکستان کے ان زعماء کی عظمت کردار نکھر اور ابھر کر قوم کے سامنے آتی رہی۔

علامہ غلام احمد پرویز نے 24 فروری 1985ء کو وفات پائی۔

(تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل، حصہ دوم، صفحات 34-33)

اقبالؒ کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں:

جناب ڈاکٹر سید نذیر نیازی نے ''اقبالؒ کے حضور میں ''نشستیں اور گفتگوئیں'' کے عنوان سے ایک بیاض یادداشت ترتیب دی تھی جس کا جزو اول یکم جنوری 1938ء اختتام 21 مارچ 1938ء پر ہوتا ہے۔ جزوِ دوم 22 مارچ سے 21 اپریل تک ہے۔ اس کتاب میں صفحہ 36 پر دوشنبہ 10 جنوری کے عنوان سے دہلی سے آنے والے اس قافلہ قلندرانِ اقبال کا ذکر ہے جو مولانا اسلم جیراجپوری کی قیادت میں 9 جنوری کو یوم اقبال کی تقریب میں شرکت کے لئے لاہور آیا تھا۔ جوانٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ نے منایا تھا۔ جس میں جناب پرویز نے ایک نہایت خیال انگیز، فکر ریز اور احساس خیز تقریر دلنشیں انداز میں ارشاد فرمائی تھی۔ اس موقعہ پر اقبال سے ملاقات کا احوال سید نذیر نیازی نے تفصیل سے لکھا ہے۔ جس کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

سید نذیر نیازی رقم طراز ہیں:

''پرویز صاحب شاید اس وقت سے جب حضرت علامہ (اقبال) نے کانگریس کے طرفدار علماء کی کوتاہ نظری پر اظہار افسوس کیا تھا، موقعہ کے منتظر تھے۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام کی تفسیر قرآن کا ذکر چھیڑ دیا اور ظاہر ہے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے بارے میں گفتگو ہوتی تو مولانا کا ذکر ضرور آتا۔ ان کی تفسیر اگرچہ برسوں کے انتظار کے بعد شائع ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ توقعات پوری نہ ہو سکیں جو مولانا کے علم و فضل سے وابستہ تھیں بالخصوص اس لئے کہ ''الاسلام بمقابلہ اسلام اور ''الدین'' بہ مقابلہ دین کی اصطلاحیں وضع کرتے ہوئے انہوں نے اسلام کی تعبیر ایک ایسے رنگ میں کی جس سے بجائے ایک واضح، قطعی اور محکم دستور حیات کے دین کی حیثیت محض ایک عقیدے، ایک نظریئے، ایک مجرد فکر اور ایک احساس کی رہ گئی۔ مولانا کے نزدیک قرآن پاک کی دعوت یہ ہے کہ جملہ مذاہب عالم ایک دوسرے کی سچائی کا اعتراف کریں۔ سب اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیمات پر کاربند رہیں تاکہ وہ سب گروہ بندیاں جو ''شرع و منہاج کے اختلاف نے پیدا کر رکھی ہیں، کالعدم ہو جائیں اور دنیا سمجھ لے کہ ''الدین'' یا ''الاسلام'' کا حقیقی مقصد کیا ہے۔ یہ

مقصد ہے خدا پرستی اور نیک عملی۔ اس لئے کہ نجات وسعادت کی اساس ہے حسن اعتاد کے ساتھ ساتھ توحید باری تعالیٰ کا اقرار۔

پرویز صاحب نے کہا وحدتِ ادیان کا یہی غلط تصور، جو مولانا نے اس طرح قائم کیا سرچشمہ ہے قرآن مجید کی اس تفسیر کا جو مولانا نے فرمائی اور جس سے برہموسماج کے نقطۂ نظر ہی کی تائید ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی دینی عصبیت کو تو کوئی تقویت نہیں پہنچتی۔ مولانا کے ارشادات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اسلام اور غیر اسلام میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہتا۔ نہ عقیدۃً نہ عملاً۔ معلوم ہوتا ہے، ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ مذہباً کانگریس کی حمایت کا جواز پیدا کیا جائے تاکہ ہم اپنے اس دعوے سے کہ مسلمانوں کی ایک جداگانہ قومیت ہے دست بردار ہو جائیں۔ مولانا کے عقائد، مولانا کے خیالات اور مولانا کے نظریات میں یہ تبدیلی افسوسناک بھی ہے اور تعجب انگیز بھی۔

پرویز صاحب نے کہا مولانا گویا دبی زبان سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ قوم کا معاملہ مذہب سے الگ ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا کی تفسیر شائع ہوئی تو رسالہ معارف میں ان کے قلم سے ایک طویل تبصرہ بھی شائع ہوا تھا (یعنی پرویز صاحب کے قلم سے)۔

حضرت علامہ (اقبال) نے فرمایا ''مدیر معارف'' نے بھی کیا اس سلسلے میں کوئی رائے ظاہر کی؟

پرویز صاحب نے کہا شروع میں تو سید صاحب نے اس تبصرے کی بڑی تعریف کی اور ان خطرات کا اقرار بھی کیا جن کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا تھا لیکن تبصرے کی دوسری قسط کا وقت آیا تو انہوں نے دفعتہ اپنی رائے بدل دی۔

''کیوں؟''

اس عذر میں کہ مولانا کی فضیلت علم اور بصیرت فی الدین مسلّم ہے۔ وہ بہت بڑے سیاسی اور دینی رہنما ہیں۔ ان کے خیالات پر گرفت کی گئی تو بہت ممکن ہے اور زیادہ غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں۔ مصلحت یہی ہے کہ سردست خاموشی اختیار کی جائے۔ مولانا کا شائد وہ مطلب بھی نہیں جو ہم سمجھتے ہیں۔

ارشاد ہوا۔ ''یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ کسی شخص کا علم وفضل یا احترام ذات ہمیں حق گوئی سے باز رکھے۔ اور وہ بھی ان مسائل میں جن کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہے۔''

چند منٹ خاموشی رہی۔ شاید مولانا کی تبدیلیٔ خیالات پر دل افسردگی کے باعث۔''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ملک منظور حسین لیل ایڈووکیٹ (دریا خان) بھکر

جناب پرویز صاحبؒ سے پہلی ملاقات

میں نے جناب پرویز صاحب کو اگست / ستمبر 1979ء میں ایک خط لکھا جس میں میں نے اُن سے بہت سے سوالات کے جوابات مانگے۔ انہوں نے مجھے انفرادی طور پر جواب دینے کی بجائے، نام اور مقام حذف کر کے، اپنے جوابات مسلمانوں کے مفاد اور معلومات کے لئے ماہنامہ ''طلوعِ اسلام'' ماہ اکتوبر 1979ء کے باب المراسلات میں ''میں نماز کیسے پڑھتا ہوں۔ میں نے کوئی جماعت کیوں نہیں بنائی؟'' کے عنوان سے شائع فرما دیئے تھے۔ میں اُن جوابات کے مطالعہ کے بعد اُن سے زیادہ متاثر ہوا اور میرے دل میں اُن سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا، لہٰذا، میں نے مورخہ 12 دسمبر 1979ء کو اُن سے اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ میرے ساتھ میرے عزیز ڈاکٹر عبدالحمید، جو کہ اُس وقت گورنمنٹ کالج (اب یونیورسٹی) میں ایف ایس سی (پری میڈیکل) کے طالب علم تھے، بھی ملاقات میں شامل تھے۔ اُس ملاقات کو میں نے تھوڑا عرصہ بعد (14 جون 1980ء کو) سپردِ قلم کر دیا لیکن شائع نہ کرا سکا۔ اب تھوڑی سی فرصت ملی ہے تو اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کرنے کی خاطر ادارہ طلوعِ اسلام کو ارسال کر رہا ہوں۔ (ممکن ہے کچھ حقائق ویسے نہ ہوں لیکن) میں نے اُس وقت جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، ایک یادگار کے طور پر پیش کر رہا ہوں:

> اپنے رفقاء سے بھی میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ وہ میرے بارے میں کچھ نہ کہیں، نہ لکھیں بلکہ وہ صرف قرآن پھیلائیں۔ میرے احباب کو ضد تھی کہ میرا کوئی لقب یا خطاب ہونا چاہیئے جس سے وہ مجھے پکاریں۔ پہلے پہلے انہوں نے تجویز کیا کہ مجھے ''چوہدری'' کہا اور لکھا جائے۔ لیکن چوہدری تو کسی گاؤں کے بڑے آدمی کو کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں، میں چوہدری وغیرہ نہیں بننا چاہتا۔ پھر انہوں نے تجویز کیا کہ مجھے ''علّامہ'' کہا جائے لیکن میں نے انہیں بتایا کہ ''علّامہ'' تو ایک بڑی ڈگری ہے جو مغربی ممالک میں یونیورسٹیاں بڑے بڑے مفکرین کو دیتی ہیں

میں اور عزیزم عبدالحمید انصاری اُن کے کمرے کا بغور جائزہ لے رہے تھے کہ مشرقی دروازہ کھلا اور ایک شخص ہاتھ ملانے کے لئے ہماری طرف بڑھا۔ درمیانہ قد، درمیانہ جسم، سانولا رنگ، سردی سے بچنے کے لئے سر پر ایک سادہ سی ٹوپی جو کہ

بازار میں صوبۂ سرحد (اب خیبر پختون خوا) کے پٹھان بیچتے ہیں۔ خاکی رنگ کی موٹی کم قیمت شلوار قمیض (شاید زین یا جین کی)، اوپر سیاہ رنگ کا ریگزین کا ایک کوٹ، پیروں میں کالے رنگ کی سادہ سی گرگابی بغیر جراب (شاید عصر یا مغرب کی نماز کے لئے وضو کرنے کی وجہ سے جرابیں نہیں پہن رکھی تھیں)، اوپر خاکی رنگ کی ایک نہایت کم قیمت (غالباً سوتی) چادر لپیٹے چہرے پر تھکان کے آثار مگر سُستی غائب۔

''السّلام علیکم:۔آپ دریا خان سے آئے ہیں؟۔'' عبدالحمید کے بعد میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے اور میری طرف دائیں ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ایک عظیم مفکر کی صورت میرے سامنے تھی۔ الحمدللہ کہ مجھے بھی یہ شرف حاصل ہوا۔

''جی ہاں! میں دریا خان سے آیا ہوں۔'' اور اس کے ساتھ ہی میرا تصور جواُن کے بارے میں تھا، یکسر بدل گیا کیونکہ میں دوسرے لوگوں سے سن سن کر جو تصور اُن کی ظاہری شخصیت کے بارے میں قائم کر چکا تھا، وہ کچھ اور تھا۔ وہ تصور دھندلا اور ہر لمحہ متغیر تھا۔ یہی صورتِ حال، کسی سے بالمشافہ ملنے سے قبل تقریباً ہر شخص کو پیش آتی ہے۔

''آپ کا آج کوئی انٹرویو تھا آرمی میں؟۔'' ساتھ والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں! آرمی ایجوکیشن کور کے لئے Apply کیا تھا میں نے، اور ابتدائی انٹرویو میں کامیاب بھی ہو گیا ہوں، خدا کے فضل سے۔''

''بہت اچھا!۔ یہ کور اچھی ہے میرے خیال میں؟۔'' انہوں نے پوچھنے کے انداز میں کہا۔

''جی ہاں!۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کا آخری مرحلہ جو کہیں کوہاٹ میں ہوتا ہے، وہ ایجوکیشن کور کے لئے بھی لازمی ہے یا نہیں؟۔''

''ہوتا ہے سر! جسے آئی ایس ایس بی کہتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھی چیز ہے، خدا آپ کو کامیاب کرے۔'' انہوں نے دعا دی۔

ان رسمی اور ابتدائی باتوں کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ جی! میں آپ کا لٹریچر کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں اور کافی متاثر ہوں۔ دوسرے احباب اور لوگوں کو بھی اس قرآنی لٹریچر کے بارے میں بتاتا رہتا ہوں۔ جہاں تک ممکن ہو قرآن کی تبلیغ بھی کرتا ہوں۔ اور لوگوں کے بوسیدہ نظریات بدلنے کی کوشش بھی کرتا رہتا ہوں۔ اپنے شاگردوں کو بھی، جو کہ نئی نسل ہے، قرآن کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی عظیم الہامی کتاب کے مطابق ان کی تربیت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہاں میں نے عزیزم عبدالحمید انصاری کے بارے میں بتایا کہ وہ میرا ایک ہونہار شاگرد ہے جس نے 718/850 نمبر حاصل کر کے دریا خان ہائی سکول Top کیا ہے اور اب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میڈیکل گروپ میں سال اول کا طالب علم ہے۔ وہ اس بات پر بہت خوش ہوئے۔ عبدالحمید انصاری کو دعا دی اور بڑی حیرانی سے کہا کہ:۔

’’718 ! بھئی یہ تو بہت ہی اچھے نمبر ہیں۔اور پھر 850 میں سے !۔‘‘

اس کے بعد وہ اچانک قریب رکھے ٹیلیفون پر چلے گئے اور کسی ڈاکٹر سے کسی مریض کے بارے میں مختصر سا مشورہ کرنے کے بعد دوبارہ اسی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے، اور بات شروع ہوگئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ:۔’’جی ! آپ کا لٹریچر لوگوں میں مقبول ہو رہا ہے لیکن لٹریچر کے ساتھ ساتھ آپ کی شخصیت زیادہ زیرِ بحث رہتی ہے۔اور چونکہ آپ سے بالمشافہ اور بلا واسطہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی، اور ہمارے پاس آپ کی ذات کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہوتیں، نہ ہی کوئی کتاب آپ کی شخصیت کے بارے میں چھپی ہے کہ اسے پڑھ کر لوگوں کو کچھ بتایا جا سکے۔لہٰذا، آپ کے بارے میں فرضی باتیں کرنا پڑتی ہیں کہ پرویز صاحب دیوبند کے بعد الازہر یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں یا اُن کی تعلیم کئی ایم اے ہے وغیرہ وغیرہ۔آپ کے بارے میں لوگ یہ بھی پوچھتے ہیں کہ پرویز صاحب باریش ہیں یا بے ریش؟۔کیا وہ سرکاری ملازم بھی رہے ہیں؟۔آپ کی تعلیم زیرِ بحث رہتی ہے اور پھر اسی لئے میں نے آپ کو خط لکھا جس میں میں نے آپ سے کچھ ذاتی سوالات بھی پوچھے۔ پھر مجھے تسلّی ہوگئی۔ وہ خط جو اکتوبر 1979ء کے طلوعِ اسلام میں چھپا اور اس کا جواب بھی آپ کی طرف سے چھپا۔‘‘

’’ہاں! وہ خط بہت اچھا تھا اور اس میں ایسے سوالات اٹھائے گئے تھے جن کا تعلق اسلام اور تحریک طلوعِ اسلام سے تھا۔لہٰذا، میں نے مناسب سمجھا کہ وہ خط اور اس کا جواب شائع کر دیا جائے۔آپ نے اچھے سوالات پوچھے تھے۔‘‘

’’اس خط کے بعد کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ۔لہٰذا، میں نے ضروری سمجھا کہ آپ سے بالمشافہہ ملاقات کر کے آپ کے بارے میں معلوم کیا جائے، گو مجھے اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ آپ شخصیت پرستی کے سخت مخالف ہیں لیکن پھر بھی کسی کی ظاہری شخصیت اور داخلی شخصیت کافی اہمیت رکھتی ہے۔‘‘ وہ میری ان طویل اور بے ربط باتوں کو بڑی خاموشی اور توجہ سے سنتے رہے۔اُن کی ابتدائی باتوں سے میرا یہ احساس اور جھجک ختم ہوگئی تھی کہ میں ایک عظیم مفکر کے سامنے بیٹھا ہوں اور مجھے طویل اور بے ربط باتوں میں اُن کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔یہ اُن کے مشفقانہ رویے کا کمال تھا جس نے مجھے اُن کے سامنے بولنے کی جراءت اور ہمت عطا کر دی تھی۔

’’جی ہاں ! میں نے شخصیت پرستی کو ہمیشہ کوئی اہمیت نہیں دی۔‘‘ وہ یوں گویا ہوئے۔’’لیکن مولویوں نے میرے بارے میں بہت سی باتیں بنا کر پھیلا دی ہیں، جن کا مجھے علم ہے لیکن پروا نہیں۔شخصیت پرستی کی مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔اپنے رفقاء سے بھی میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ وہ میرے بارے میں کچھ نہ کہیں، نہ لکھیں بلکہ وہ صرف قرآن پھیلائیں۔میرے احباب کو ضد تھی کہ میرا کوئی لقب یا خطاب ہونا چاہیئے جس سے وہ مجھے پکاریں۔ پہلے پہلے انہوں نے تجویز کیا کہ مجھے’’چوہدری‘‘ کہا اور لکھا جائے۔لیکن چوہدری تو کسی گاؤں کے بڑے آدمی کو کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں، میں چوہدری وغیرہ نہیں بننا چاہتا۔پھر انہوں نے تجویز کیا کہ مجھے’’ علاّمہ‘‘ کہا جائے لیکن میں نے انہیں بتایا کہ’’علاّمہ‘‘ تو ایک بڑی ڈگری ہے جو مغربی ممالک میں یونیورسٹیاں بڑے بڑے مفکرین کو دیتی ہیں۔وہ لوگ‘‘

ڈاکٹر'' کہلاتے ہیں۔ میں اس قابل نہیں۔ دوسرے میرے پاس کوئی ایسی ڈگری بھی نہیں کہ میں ایسا کہلاؤں یا کہلانے کا حق رکھوں۔ میں صرف ''پرویز'' ٹھیک ہوں۔ پھر چونکہ بچیاں مجھے ''باباجی'' کہتی ہیں تو احباب ورفقاء نے بھی مجھے ''باباجی'' ہی کہنا شروع کر دیا۔ میں خاموش ہو گیا کہ چلو! کوئی بات نہیں۔''

''سر! آپ کا اصل شہر ہندوستان میں ہے؟۔''

''جی ہاں! بٹالہ۔''

''تو پھر آپ نے تعلیم کس جگہ اور کہاں تک حاصل کی؟۔'' میرا سوال تھا۔

''قرآن وحدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم تو میں نے گھر ہی میں اپنے دادا سے پڑھے۔ اور میٹرک میں نے بٹالہ سے پاس کیا۔ پھر میں نے ایف اے اور بی اے پرائیویٹ کئے، سروس کے معاملات اور ضروریات کے لئے۔''

''تو آپ کی تعلیم صرف بی اے ہے؟۔''

''جی ہاں!۔''

''اور آپ نے سروس کون سی کی؟۔'' میں نے پوچھا۔

''ہندوستان کی مرکزی حکومت میں ایک ڈیپارٹمنٹ ہوتا تھا جسے انگریزی میں Interior Division کہتے ہیں اس میں میں۔۔۔۔ (جب وہ یہاں پہنچے تو باہر کسی گاڑی کے ناگوار اور زیادہ شور کے باعث اُن کی دھیمی آواز صاف ہونے کے باوجود ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی، لہٰذا، میں نہ سن پایا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟۔ وہ ہماری طرف دیکھ دیکھ کر اُسی طرح بڑے آرام و اطمینان سے وضاحت کرتے رہے۔ لگتا تھا جیسے وہ ایسے شور کے عادی ہیں اور اس کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ اور میں اس خیال سے کہ انہیں بار بار سوال کر کے وضاحت پر مجبور اور پریشان نہ کروں، اُن کی طرف دیکھتا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ عبدالحمید کے کہنے کے مطابق انہوں نے بتایا کہ وہ وزارتِ داخلہ ہند میں آفس سپرنٹنڈنٹ رہے۔ میں یہ بھی سوچتا رہا کہ اُن کی رہائش گاہ کچھ پُرسکون مقام پر واقع نہیں۔ گاڑیوں کا شور گاہے بگاہے اُن کی سوچوں اور فکر کے تسلسل میں مخل ہوتا ہوگا۔ جو کہ ایک تکلیف دہ امر ہے۔ اور مجھ جیسے آدمی کے لئے ناقابل برداشت۔ لیکن شاید بڑے شہروں میں سکون کی صورتِ حال ہی ایسی ہوتی ہے جس کی پروا بڑے لوگ نہیں کرتے)۔

> ''جی! اگر آپ کے لٹریچر کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو یہ غیر ممالک میں بہت مقبول ہوگا۔''
>
> ''جی ہاں!۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں یہ کام اکیلا کر رہا ہوں۔ میں اکیلا سارے کام نہیں کر سکتا۔ کوئی اور میرے ساتھ نہیں۔ یہ کام اب کسی اور کو کرنا چاہیئے۔ مگر اس کے لئے خود کو وقف کرنا پڑتا ہے

میں نے کہا:۔ ''دلی میں؟۔''

''جی ہاں! دلی میں۔'' پھر کچھ توقف کے بعد:۔''پھر میں نے سروس سے خود ہی ریٹائرمنٹ لے لی کیونکہ کام ایک ہوسکتا تھا۔سروس یا قرآن کی خدمت۔پھر میں نے مکمل توجہ سے یہ کام شروع کر دیا۔یہ میرا مشن ہے۔''

''سر! آپ علّامہ اقبالؒ کے شاگرد ہیں؟۔''

''وہ شاگرد تو کسی کو بناتے نہیں تھے۔البتہ اُن کی محفلیں Attend کرتا تھا۔کہیں 1934۔1933ء میں۔''

''مودودی صاحب سے بھی آپ کے تعلقات رہے ہوں گے؟۔''

''اُن سے میرے تعلقات رہے مگر پاکستان آ کر تو وہ کچھ اور بن گئے تھے۔''

''پھر تعلقات نہیں رہے؟۔'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں، بالکل نہیں رہے۔''

''سر! یہ علمِ نجوم کیا ہے؟۔''

''کچھ بھی نہیں۔''

''تو یہ جو قرآن میں آیا ہے کہ ستارے تمہاری راہنمائی کرتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟۔کیا یہ ہماری قسمت کے معاملے میں ہماری راہنمائی نہیں کرتے؟۔قرآن تو ایک جامع کتاب ہے، کیا اس آیت کے یہ معانی نہیں لئے جاسکتے؟۔اس سے قسمت کی راہنمائی مراد نہیں لی جاسکتی؟۔''

''وہ راہنمائی اس قسم کی ہے کہ جب لوگ سمندروں یا صحراؤں میں سفر کرتے تھے تو راستہ بھول جانے پر وہ اپنا راستہ ستاروں کے ذریعے معلوم کرتے تھے۔اب بھی ایسا ہوتا ہے۔سمندروں میں تو خیر اب جدید سائنسی آلات، قطب نما وغیرہ لگ گئے ہیں لیکن صحراؤں میں جانے والے لوگ اب بھی ستاروں سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔''

''تو گویا اس راہنمائی سے مراد صرف جغرافیائی راہنمائی ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی ہاں! صرف جغرافیائی۔کیونکہ انسان صاحبِ اختیار ہے۔صاحبِ اختیار کا معاملہ کچھ یوں ہے کہ انسان خود نہیں بتا سکتا کہ میں کل کیا کروں گا یا کل کیا ہوگا؟۔(یہاں انہوں نے قرآن کی ایک آیت بھی پڑھی جو مجھے اب یاد نہیں ہے)۔جب انسان خود نہیں بتا سکتا' اپنے ارادے کے باوجود، تو پھر کوئی دوسرا کیسے بتا سکتا ہے کہ آپ کے ساتھ یا فلاں کے ساتھ کل یہ کچھ ہونے والا ہے۔'' کچھ توقف کے بعد انہوں نے مزید بتایا کہ:۔''آج کل کے ایک فرانسیسی سائنس دان نے ایک کتاب لکھی ہے (انہوں نے سائنس دان اور کتاب کا نام بھی بتایا مگر مجھے اُن ناموں کی سمجھ نہ آئی)۔جس میں اس نے لکھا ہے کہ سورج جیسی بڑی Body صاحبِ اختیار نہیں' لہٰذا' ہم میں سے صرف ایک یا چند سائنس دان ایک میز پر بیٹھ کر سورج کے متعلق بتا سکتے ہیں کہ آج سے اتنے سالوں کے بعد فلاں دن' فلاں وقت پر ٹھیک اتنے بج کر اتنے منٹ' حتیٰ کہ اتنے سیکنڈ پر سورج کو گرہن لگے گا۔مگر ہم ہزار سائنس دان بھی مل کر یہ نہیں بتا سکتے' یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہماری میز پر جو مکھی جیسی حقیر مگر (سورج

کے مقابلے میں زیادہ) صاحبِ اختیار وارادہ مخلوق بیٹھی ہے، اب اُڑ کر کہاں بیٹھے گی؟۔(میری ناک پر یا آپ کی ناک پر؟)۔ یہ ہے صاحبِ اختیار وارادہ اور غیر صاحبِ اختیار وارادہ کا معاملہ!۔انسان صاحبِ اختیار وارادہ ہے۔''

''جی! اگر آپ کے لٹریچر کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو یہ غیر ممالک میں بہت مقبول ہوگا۔''

''جی ہاں!۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں یہ کام اکیلا کر رہا ہوں۔ میں اکیلا سارے کام نہیں کر سکتا۔کوئی اور میرے ساتھ نہیں۔ یہ کام اب کسی اور کو کرنا چاہیئے۔مگر اس کے لئے خود کو وقف کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو کوئی ایسا آدمی کرے جو خود کو وقف کر دے۔لیکن ہمارے ہاں روٹی کا مسئلہ کچھ ایسا ہے جو ایسا کرنے میں مانع ہے۔کوئی شخص ایسے کام کو کیسے وقت دے جس میں مالی مفاد نہ ہو؟۔روٹی کا مسئلہ ایسا کرنے نہیں دیتا۔ یہ کام پاکستان سے نہیں، باہر سے ہونے کی امید ہے۔علاوہ ازیں، میں نے جو قرآنک ریسرچ سنٹر کی سکیم بنائی ہے، وہاں یہ کام ہوگا۔ کیونکہ کالج میں داخلہ لینے والے طلباء وہاں کم از کم دو سال رہیں گے۔اُن سے یہ کام لیا جا سکے گا۔انہیں تیار کر کے اُن سے یہ کام لیا جانا آسان ہے۔اب تو کوئی آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔طلباء تو تعلیم کے سلسلے کی وجہ سے کوئی دوسرا کام نہیں کریں گے جبکہ دوسرے لوگوں کو روٹی کا مسئلہ اِدھر متوجہ نہیں ہونے دے گا۔'' اُن کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور فرمایا: ''یہی میرا قرآنک ریسرچ سنٹر ہے، یہی میرا گھر، یہی میری بیٹھک ، یہی ملاقاتیوں کا کمرہ اور یہی میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ۔وسائل ہی اتنے ہیں۔امیر لوگ کب ہمارا ساتھ دیتے ہیں؟۔اور مولویوں نے ویسے میرے خلاف بہت شور مچا رکھا ہے۔''

''جی! یہ مولوی بھی عجیب لوگ ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب تو ان کے خلاف کافی نفرت بڑھ رہی ہے۔پچھلے دنوں میں اپنے ساتھیوں کو بتا رہا تھا کہ مولویوں نے مذہب کو جان بوجھ کر الجھا رکھا ہے۔تاکہ یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔اور اسے سمجھنے کے لئے لامحالہ مولوی صاحب کی ضرورت پڑے۔اور لوگوں کو اُسی کی طرف رجوع کرنا پڑے۔مولوی خود کو مذہب کا اجارہ دار سمجھتے ہیں۔انہوں نے قرآن کے علاوہ دوسری بہت سی کتب کا سہارا لے رکھا ہے تاکہ سیدھی راہ کسی کو نظر نہ آسکے۔انہوں نے مذہب کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔۔اسی لئے نئی نسل مذہب سے برگشتہ ہو رہی ہے۔جب کوئی مسئلہ سامنے آئے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کا حل یہ ہے اور یہ حل فلاں کتاب کی رو سے ہے۔اب مشکل یہ ہے کہ قرآن تو ہر گھر میں موجود ہے اور مولوی صاحب کی بات کو قرآن میں ہر شخص ڈھونڈ سکتا ہے۔اور نہ ملنے کی صورت میں مولوی صاحب کا گریبان پکڑ سکتا ہے۔لیکن مولوی صاحب قرآن کی بجائے حدیث کی کسی کتاب یا فقہ وغیرہ کا نام لے گا۔اب نہ تو ہر گھر میں صحاح ستہ موجود' نہ فقہ' نہ تاریخ' نہ فتاویٰ عالمگیری۔اب کون مولوی صاحب کی بات کی تصدیق کی زحمت کرے۔ نہ کسی میں یہ مالی ہمت و استطاعت' نہ علمی و عملی ہمت کہ کوئی قرآن کے علاوہ باقی تمام کتب بھی خرید کر گھر میں رکھے اور انہیں پڑھے' اس مصروفیت کے دور میں!۔ لہٰذا' لامحالہ دینی معاملات کے لئے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔مولوی صاحب یہاں اپنی من مانی کرتے ہیں۔کیونکہ وہ ہماری کمزوری جانتے ہیں۔اُن کا طریقِ کار یعنی تیکنیک (Technique) کامیاب ہو جاتی

ہے۔قرآن کی ہر گھر میں موجودگی اور پھر صرف تیس پاروں میں اختصار و جامعیت مولوی صاحب کے وجود کے لئے خطرہ ہے۔لہٰذا، اس نے دوسری کتب میں لوگوں کو الجھا کر قرآن کو چھپا لیا ہے۔اب سیدھی راہ نظر نہیں آتی۔نئی نسل اسی لئے مذہب اور مولوی سے برگشتہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب کے نصاب میں قرآن کے علاوہ اس قدر کتب موجود ہیں کہ قرآن ان میں نظر ہی نہیں آتا''۔پرویز صاحب میری ان بے ربط باتوں کو غور سے سنتے رہے۔پھر میں نے پوچھا کہ:۔

''آپ کا پریس ہے؟''۔

> قرآن کی ہر گھر میں موجودگی اور پھر صرف تیس پاروں میں اختصار و جامعیت مولوی صاحب کے وجود کے لئے خطرہ ہے۔لہٰذا، اس نے دوسری کتب میں لوگوں کو الجھا کر قرآن کو چھپا لیا ہے۔اب سیدھی راہ نظر نہیں آتی

''جی نہیں!۔پریس نہیں ہے۔اور بڑی تکلیف رہتی ہے۔ہماری ایک ایک کتاب بعض اوقات دس دس سال تک دوبارہ نہیں چھپ سکتی''۔

''اب تو آپ کالج قائم کر رہے ہیں۔پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے پاس۔خدا کرے وہ کامیاب ہو جائے''۔

''جی ہاں! ریسرچ سنٹر بھی وہیں چلا جائے گا''۔

''اب تو سر! آپ کا لٹریچر بہت لوگ پڑھ رہے ہیں۔یہاں بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے؟''۔

''جی ہاں! اب کافی لوگ ہیں۔پہلے تو جھینپتے تھے۔اب نام سن لیتے ہیں۔دوسرے، اگر یہ حق ہے تو ضرور پھیلے گا۔حق کو میری یا آپ کی مدد کی ضرورت نہیں (یہاں انہوں نے اس معاملے میں قرآن کی ایک آیت بھی پڑھی)۔حق تو اپنے زورِ دروں (Momentum) پر آگے بڑھتا ہے۔البتہ ہمارا عمل صالح اس کی رفتار کو تیز کر دیتا ہے۔ویسے اسے کسی اور کی مدد کی ضرورت نہیں۔حق خود بخود پھیلتا چلا جائے گا''

''نہیں جی!۔اب ماشاء اللہ، دور دور تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہے۔اب لوگ آپ کا لٹریچر پڑھتے ہیں۔جو لوگ سنجیدہ اور پڑھے لکھے ہیں۔میرا ایک دوست ہے۔خاصا تعلیم یافتہ۔ایم ایس سی ریاضی میں ہے۔میں جب بھی آپ کا نام اس کے سامنے لیتا تھا، وہ کہتا تھا کہ وہی پرویز جو حدیث کا منکر ہے۔اُس کا نام میرے سامنے لیتے ہو (حالانکہ ایک دلچسپ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود ایک دہریہ قسم کا شخص تھا)۔ایک دن میں نے اُس سے کہا کہ یار! یہ بتاؤ کہ تم نے پرویز صاحب کا لٹریچر پڑھا بھی ہے؟۔وہ کہنے لگا کہ:۔ ''نہیں!۔'' میں نے کہا کہ پھر پرویز کی مخالفت کس منہ سے کرتے ہو؟۔اس پر وہ خاموش ہو گیا۔اب آپ کا لٹریچر کبھی کبھی پڑھ لیتا ہے۔اور کم از کم آپ کی مخالفت نہیں کرتا۔اور کمیونسٹ ہونے کے باوجود کہتا ہے کہ:۔''ہاں! پرویز مفکر معلوم ہوتا ہے''۔

''ہاں بھئی! ہم منکرِ حدیث ہیں۔لیکن ذرا یہ بھی تو پوچھو کہ کون سی اور کس قسم کی حدیث کے منکر ہیں؟۔ہم ایسی حدیثوں کو بالکل نہیں مانتے اور واضح انکار کرتے ہیں جو قرآن سے متصادم ہوں یا جن میں سے حضور پاک ﷺ یا اُن (ﷺ) کے

ساتھیوں کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ہم ایسی احادیث سے صریح انکار کرتے ہیں۔اور اگر ہمیں کوئی منکرِ حدیث کہہ دے تو ہم جھینپتے نہیں۔ہم تو علی الاعلان ایسی احادیث کے منکر ہیں۔''

پھر میں نے بتایا کہ:۔''اب نئی نسل آپ کے لٹریچر سے کافی متاثر ہے۔میں نے عبدالحمید انصاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ میرا عزیز شاگرد ہے۔میرے پاس پانچویں جماعت پڑھا۔جب یہ گورنمنٹ کالج لاہور پہنچا تو اس نے کہیں آپ کی کتاب ''ذرے'' دیکھی۔کسی لائبریری میں صرف نام لکھا ہوا تھا۔جو شاید ایٹم بم کے بارے میں تھی مگر وہ اسے مل نہ سکی۔(یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اب پرویز صاحب کو یاد نہ ہو کہ انہوں نے کبھی ایسی کوئی کتاب یا مقالہ لکھا ہو۔نہ ہی مجھے اُن کی کسی ایسی تحریر کے بارے میں علم تھا۔یہ صرف حمید انصاری کی معلومات میں تھی)۔عزیزم عبدالحمید نے آپ کی دوسری کتاب ''اسلامی نظام کیسے نافذ ہوسکتا ہے؟۔''لائبریری سے نکلوا کر پڑھی اور بہت متاثر ہوا۔جب میں نے آپ سے ملاقات کا پروگرام بنایا تو اس نے بھی میرے ساتھ آنے کی خواہش ظاہر کی۔اور میرے ساتھ آپ تک پہنچا۔معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تحریر نوجوانوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔''

''جی ہاں! میرا مخاطب تعلیم یافتہ نوجوانوں کا طبقہ ہے۔''انہوں نے کہا۔

اس پر حمید انصاری نے بتایا کہ:۔''سر! اُس کتاب ''اسلامی نظام کیسے نافذ ہوسکتا ہے؟۔''پر کسی قاری نے بہت سے نوٹ چڑھا رکھے تھے اور پہلے صفحہ پر لکھا تھا۔''یہ کتاب کسی دہریئے نے لکھی ہے۔''لیکن جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو میں حیران رہ گیا کہ کیا دہریہ اسے کہتے ہیں جس نے یہ کتاب لکھی ہے؟۔کمال کی بات ہے!۔''

''جی ہاں! ہم ان کے خدا کو نہیں مانتے۔اُن کے خدا کے ہم دہریئے ہیں۔جو اُن کے تصور کا خدا ہے، ہم اسے نہیں مانتے۔اسی لئے اُس نے دہریہ لکھا ہوگا کہ جو خدا اُن کے ذہنوں میں موجود ہے، ہم اس کے منکر ہیں۔''

یہاں مجھے یہ بات یاد آ گئی کہ دہریئے اکثر کہتے ہیں کہ اسلام میں وہ سپرٹ (قوت) ہی نہیں کہ وہ پھیلے یا اپنے پیروکاروں میں وہ قوت پیدا کر دے کہ وہ دنیا پر چھا جائیں۔یا انسانیت کے لئے کوئی اچھا نمونہ پیش کر سکیں۔اسلام تیس سالوں کے اندر اندر ناکام ہو گیا تھا اور آگے نہ پھیل سکا۔کیونکہ اُس میں پھیلنے کی قوت ہی نہیں تھی۔میں نے یہی گزارش پرویز صاحب کی خدمت میں پیش کر دی تو وہ کہنے لگے کہ:۔

''اُن سے پوچھیئے کہ دہریت کتنی پھیلی ہے؟۔خدا اور مذہب تو کسی نہ کسی صورت میں ذہنوں میں موجود ہیں۔مگر آج تک کتنے لوگوں نے دہریت کو اپنایا ہے؟۔''

''جی سر! واقعی خدا ذھن کے کسی نہ کسی کونے میں ضرور موجود رہتا ہے۔''میں نے کہا۔

وہ کہنے لگے:۔''غالباً صحیح معنوں میں دھریہ شاید ہی کوئی آپ کو ملے!۔''

میں نے کہا کہ:۔''پاکستان میں تو اسلامی نظام کے نفاذ کے امکانات نظر نہیں آتے۔آپ کا کیا خیال ہے اسلام کس

ملک میں آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ روس میں اسلام کے نفاذ کا امکان نظر آتا ہے کیونکہ روس کا معاشی نظام، اقبالؒ کے مطابق ،اسلام کے معاشی نظام سے مماثلت رکھتا ہے۔''

وہ کہنے لگے:۔'' ہاں! واقعی پاکستان میں تو اسلام کے نفاذ کے امکانات معدوم ہیں۔ کیونکہ جہاں مذہب اور مذہبی پیشوائیت کی طاقت موجود ہوگی وہاں دین کو قبول اور نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب اور دین میں فرق ہے۔ میں نے اس فرق پر بہت وضاحت سے بار بار لکھا ہے۔ روس میں اسلام کی قبولیت اور نفاذ کا امکان نہیں کیونکہ روس کا مکمل نظام کمیونزم ہے اور کمیونزم بھی ایک مذہب ہے جو اسلام کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر کمیونزم یا سوشلزم کا کوئی حصہ کسی حد تک اسلام سے مماثلت رکھتا ہے تو یہ محض اتفاق ہے یا اسلام ہی سے ماخوذ ہے، اسے اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ میری نظر میں اگر اسلام آئے گا تو اس کا امکان شاید انگلینڈ میں ہے کیونکہ وہاں مذہب یا مذہبی پیشواؤں کی وہ طاقت موجود نہیں جو دیگر مقامات پر ہے۔ انگلستان کے لوگ علمی لحاظ سے بلند اور آزاد سوچ کے مالک ہیں۔ وہ کسی خاص سوچ کے پابند نہیں۔ ایسے لوگ حق کو قبول اور نافذ کر سکتے ہیں۔ انگلستان کے مفکرین اسلام جیسے نظام کے متلاشی نظر آتے ہیں مگر اُن کے سامنے قرآن صحیح طرح آیا نہیں اور ہم مسلمانوں نے قرآن صحیح طرح پیش نہیں کیا۔ میں اُن کے نظریات بڑی تفصیل سے کئی بار پیش کر چکا ہوں۔''

''سر! لوگ نظریہء پاکستان کی بہت مخالفت کرتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ آپ اس بارے میں کچھ لکھیں۔ بڑا دکھ ہوتا ہے جب سکولوں کے اساتذہ جو معصوم ذہنوں کو آسانی سے متاثر کر سکتے ہیں، اس نظریئے کی دھجیاں بکھیرتے ہیں تو بہت پریشانی ہوتی ہے۔''

''اُن سے پوچھئے کہ نظریہء پاکستان ہے کیا؟۔ وہ کس نظریہء پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں؟۔ دراصل انہیں معلوم ہی نہیں کہ نظریہء پاکستان ہے کیا؟۔ آپ اُن سے نظریہء پاکستان کی تعریف پوچھئے۔ وہ نہیں بتا سکیں گے۔ کبھی کچھ کہیں گے، کبھی کچھ۔ اُن سے پوچھئے کہ وہ کس بات کی مخالفت کرتے ہیں؟۔ اس بارے میں میں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ بس چھوڑیں اسے۔ اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔''

''آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟۔'' میں نے سوال کیا۔ (مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ غالباً انہوں نے ''مطالب الفرقان'' کی تیسری جلد کی بات کی)۔ ''مطالب الفرقان'' کی تیسری جلد اب ختم ہوئی ہے۔ اب تصوف پر لکھ رہا ہوں۔''

''اب حمید نے سوال کیا کہ:۔'' سر! یہ جو قرآن میں آیا ہے کہ نماز پڑھو۔۔۔''

''نہیں! قرآن میں تو کہیں بھی نہیں آیا کہ نماز پڑھو۔ وہاں تو۔۔۔'' وہ بولے۔

حمید نے کہا:۔'' جی! نماز قائم کرو۔''

''ہاں بیٹے! نماز قائم کرو، آیا ہے۔ قرآن کا حکم ہے کہ نماز قائم کرو۔''

میں نے حمید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ:۔'' اور نماز کا قائم کرنا ایک پورا نظام ہے۔ قیامِ صلواۃ۔۔۔''

حمید نے سوال جاری رکھتے ہوئے پوچھا کہ:۔ ''قرآن میں آیا ہے کہ نماز قائم کرو اور مولوی صاحبان ہم سے کہتے ہیں کہ جی! اتنی رکعتیں ادا کرو، اتنی سنت، اتنی نوافل وغیرہ تو وہ تو ہمیں عشاء کی نماز میں تھکا دیتے ہیں۔کیا نماز اسی طرح ادا کرنا چاہیئے؟۔''

''دیکھیں! قرآن میں آیا ہے کہ نماز قائم کرو۔بس جس طرح امت نماز ادا کر رہی ہے، وہی ٹھیک ہے۔اس میں ردوبدل کا کسی کو اختیار نہیں۔سوائے صحیح اسلامی مملکت کے۔میں اس معاملے میں کوئی اختراع نہیں کرنا چاہتا۔اس طرح امت میں پھوٹ کا اندیشہ ہے۔پہلے ہی امت میں تفرقہ بازی کیا کم ہے کہ میں بھی ایک نیا طریقہ ایجاد کر کے انتشارِ امت کا سبب بنوں؟۔''

یہاں میں نے حمید سے کہا کہ میں تمہیں اس بارے میں سمجھاؤں گا اور وہ رسالہ دوں گا جس میں جناب پرویز صاحب نے میرے خط کا جواب دیا ہے۔وہاں نماز کی ادائیگی کی وضاحت ہوجائے گی۔

اس پر میں نے اجازت چاہی کیونکہ خلافِ توقع اور پرویز صاحب کے حسنِ سلوک، خندہ پیشانی اور مشفقانہ رویے کے سبب ہم نے اُن کا کافی وقت لے لیا تھا۔اس دوران میں کہیں بھی اُن کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار نہ ہوئے کہ یہ لوگ خواہ مخواہ کی باتوں میں میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔جب ہم اٹھنے لگے تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔انہوں نے دعا دی کہ:۔''آپ کے قرآنی ذوق سے بہت خوشی ہوئی ہے۔آپ کا قرآنی ذوق اچھا ہے۔اللہ اس میں اضافہ کرے۔''اور حمید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ:۔''برخوردار! آپ تو لاہور میں رہتے ہیں۔آپ تو درسِ قرآن میں شرکت کیا کریں۔جمعہ شریف کو ساڑھے نو بجے صبح۔اس درس میں آپ کو قلیل وقت میں بہت سی کتب کا مواد مل جائے گا۔جو کچھ بہت سی کتب میں ملے گا، وہ صرف ایک درس میں مل جائے گا۔بلکہ اس سے بھی شاید زیادہ۔''

''جی! درس کس مسجد میں ہوتا ہے؟۔''حمید نے پوچھا۔تو پرویز صاحب زیرِلب مسکرائے اور کہا کہ:۔

''تم تو بھولے ہو عزیزم!۔کیا مسجدوں میں قرآن پڑھایا جاتا ہے؟۔''اس پر ہم سب ہنس پڑے۔انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ:۔

''وہاں (مسجدوں میں) تو اور باتیں ہوتی ہیں۔''

میں نے کہا کہ:۔''وہاں آپ کو تو جانے بھی نہیں دیتے ہوں گے؟۔''وہ مسکرا پڑے۔کہنے لگے آپ نے تو میرا اچھا خاصا انٹرویو لے لیا ہے۔ہم نے مصافحہ کیا۔وہ لکھنے کی اپنی میز کی جانب چل پڑے اور ہم گہرے تاثرات کے ساتھ باہر آ گئے۔

(محررہ: 14 جون 1980ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خواجہ ازہرعباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن کریم کا انقلاب انگیز اور انسانیت ساز نعرہ

یوں تو قرآن کریم نے بڑے بڑے انقلاب انگیز نعرے بلند کئے۔ ملوکیت حرام کر کے احترام انسانیت کو اہمیت دی۔ بردہ فروشی بند کی۔ مساوات واخوت انسانی کا درس دیا۔ روح کا تصور دنیا کے سارے مذاہب کی جان ہے قرآنِ کریم نے اس کی تردید کر کے نفس انسانی کا نظریہ پیش کیا اور اس کا معاشرہ کی اساس قرار دیا۔ اس کے علاوہ ایک اور تہلکہ انگیز نظریہ پیش کیا: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) ترجمہ اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دے جو بچے اپنے خرچ سے (ترجمہ حضرت شیخ الہند)

(2) تدبر قرآن میں مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے اس آیت وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) کا ترجمہ تحریر کیا اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں کہہ دو جو ضروریات سے باقی بچے۔

(3) جلالین نے الْعَفْوَ کے معنی وہ مال فاضل تحریر کئے ہیں۔

(4) سرسید احمد خاں نے الْعَفْوَ کا ترجمہ حاجت سے زیادہ مال کیا ہے۔

(5) امام راغب نے اپنی مفردات میں الْعَفْوَ کا ترجمہ ہر وہ چیز جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

(6) تفسیر عروۃ الوثقیٰ میں اس آیت کا ترجمہ مرقوم ہے اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ ان سے کہہ دو جس قدر ضروریات زندگی سے فاضل ہو۔

(7) تفسیر نمونہ ایران میں دس شیعہ علماء نے مل کے اجتماعی سوچ بچار کے بعد تحریر کی ہے۔ یہ ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہونے کے بعد کا غالباً ایرانی حکومت کی ایماء اور ایران کی سرپرستی میں تحریر کی گئی ہے۔ اس تفسیر میں اس آیت کے متعلق تحریر ہے اور تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ ''تمہاری ضرورت سے جو زیادہ ہو''۔

اس تفسیر نمونہ میں اس آیت کے ذیل میں الْعَفْوَ کے بارے میں تحریر ہے کہ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ وہ چیز ہے جو سال کا مخارج سے بچ جائے۔ (جلد اوّل، ص:514)

(8) مولانا مودودی مرحوم نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں اس آیت کا ترجمہ تحریر کیا ہے پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو اس ترجمہ میں مولانا صاحب نے ''راہ خدا'' کا اضافہ خود کیا ہے۔ یہ اضافہ اور کسی

مفسر نے نہیں کیا۔ اور ان الفاظ ''راہ خدا'' کی یہاں گنجائش بھی نہیں ہے تاہم اَلْعَفْوَ کا ترجمہ وہی ضرورت سے زیادہ کیا ہے جو سب مفسرین نے کیا ہے کیونکہ یہ اس کے لفظی معنی ہیں اور جب تک عربی لغات باقی ہیں یہ ترجمہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

(9) مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد شفیع نے اپنی مشہور تفسیر معارف القرآن میں اس آیت کے ذیل میں تحریر کیا ہے اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دے جو کچھ بچے اپنے خرچ سے۔

(10) ہندوستان کے مشہور عالم مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اپنی تفسیر، تفسیر ماجدی میں اس آیت کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں آپ کہہ دیں جتنا بھی آسان ہو۔

(11) محی الامت، امام الائمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

سوال می کنند ترا چہ چیز خرچ کنند بگو خرچ کنید زیادہ را

سورۂ توبہ میں ارشادِ گرامی ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (9:103) ان کے مال سے زکوٰۃ لے۔ اس آیت کے ذیل میں سب مفسرین نے خذ کے معنی لینا ہی کئے ہیں۔ ان سب کو یہاں نقل کرنے سے مضمون بہت طویل ہو جائے گا اس لئے آپ خود وہ معانی چیک کر لیں۔ اَلْعَفْوَ اور خُذْ دونوں الفاظ کی تشریح تحریر کرنے کے بعد اب ہماری زیرِ نظر آیت کی تفسیر آسان ہو گئی ہے ارشادِ گرامی ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (7:199)۔ عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس آیت کا ترجمہ عادت کر درگزر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنارہ کر جاہلوں سے، کیا ہے۔ اسلامی مملکت جو احکام نافذ کرتی ہے ان کو معروف اور جن احکام میں کسی کام سے منع کرتی ہے ان کو قرآن منکر کہتا ہے اور اسلامی مملکت ان کو by force جاری کرتے ہے۔ ہمارے پیشِ نظر آیت میں خُذِ کے زیادہ مناسب معنی ''لینے'' کے معلوم ہوتے ہیں۔ سیاق و سباق بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ تصریفِ آیات سے ان دو الفاظ کی تشریح کرنے کے بعد اس آیت کریمہ کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے ارشادِ گرامی ہے تم اے رسول نظامِ ربوبیت کے قیام کی برابر کوشش کرتے رہو اور جماعتِ مومنین کا زائد از ضرورت مال (اَلْعَفْوَ) ان سے لے کر اسلامی مملکت کے سپرد کرتے رہو اور اس طرح اس کو مستحکم کرتے جاؤ اور جاہلوں کے منہ نہ لگو۔

یہ بات بھی واضح کر دینی ضرور ہے کہ ''اَلْعَفْوَ'' کو لینے کا حق اسی مملکت کو ہوگا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو جاری کر رہی ہو گی۔ غیر قرآنی مملکت کو اس کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ مملکت جو کچھ لے گی غصب ہوگا۔

ہمارے وزیر اعظم جناب عمران خاں صاحب ریاستِ مدینہ کے قیام پر اصرار کر رہے ہیں جو بہت مبارک اقدام ہے۔ کون مسلماں اس کو نہیں سراہے گا۔ ہماری ان سے درخواست ہے کہ وہ جلد سے جلد قرآن کریم کے ''معروف'' جاری کریں اور پاکستان کے امیروں سے جنہوں نے پاکستان لوٹ لوٹ کر تباہ کر دیا ہے ان سے ضرورت سے زیادہ مال ''اَلْعَفْوَ''، لیکر اسلامی مملکت کے بیت المال میں جمع کرا دیں۔ قرآنِ کریم کی یہ صرف تجویز نہیں ہے بلکہ یہ ان کے لئے حکم ہے جس کا ادا کرنا وزیر اعظم کا فرض اور عبادتِ خداوندی ہے۔

تسوید و تصحیح
محمد ارشد، سلیم اختر

پرویز کا پیغام بچوں کے نام

پرویز صاحب نے کچھ دروس ننھے بچوں کے لئے بھی ریکارڈ کرائے تھے۔ اس سلسلے کے چوتھے درس کی ٹرانسکرپشن مناسب ایڈیٹنگ کے بعد پیشِ خدمت ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔ (ادارہ)

السلام علیکم

آؤ بچو! بہت اچھا ہوا تم بہت وقت پر آ گئے اور آج تمہیں اور بہت سی باتیں بتائیں گے۔

> اللہ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ جس کی امانت ہو اُس کی امانت واپس دے دیا کرو۔ خواہ اس نے کسی کے سامنے دی ہو یا اکیلے میں دی ہو۔ سنو بھئی امانت میں اور باتیں بھی داخل ہو جاتی ہیں تمہاری نگاہ نہیں اُدھر جائے گی۔

قرآن شریف میں بھی وہی جو تمہاری روزمرہ کی زندگی ہوتی ہے، ارے بھائی یہ بات تم بھول گئے ہو جب تم آتے ہو تو کہتے ہے السلام علیکم اور جاتے ہو تو کہتے ہیں السلام علیکم۔ کیا تم کو پتا ہے اس کے کیا معنی ہوتے ہیں سلام۔۔۔ سلام کے معنی ہیں امن۔ امن اور سلامتی سے رہیں۔ اچھی طرح سے رہو۔ کوئی کسی قسم کی تمہیں برائی اور تکلیف نہ آئے کوئی مصیبت نہ آئے کوئی، پریشانی نہ آئے ہر طرح سے امن، چین اور خیریت سے رہیں۔ یہ ہیں السلام علیکم کے معنی تم پر ہر قسم کی سلامتی ہو اور سلامت رہو خیریت سے رہو اور اس کے جواب میں دوسرا کہتا ہے وعلیکم السلام۔

تم بھی خیریت سے رہو تم بھی اچھی طرح سے رہو کوئی کسی قسم کی تمہیں تکلیف نہ ہو یا کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔ دیکھا السلام علیکم کہو یہی نہیں کہ تم دوسروں کے گھر جاؤ تو السلام علیکم کہو جب اپنے گھر میں بھی آؤ تو وہاں بھی السلام علیکم کہو۔ یہ قرآن شریف اس طرح کی مکمل باتیں بتاتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں سب بتاتا ہے۔ انسان قرآن شریف کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل کرنے سے ہی بڑا ہو جاتا ہے۔ قرآن شریف کہتا ہے: فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً (24:61) جب تم گھر میں آؤ تو اپنے گھر والوں کو اللہ کی طرف سے خیریت کی دعا کہا کرو اور وہ دعا بڑی برکتوں والی دعا ہے۔ السلام علیکم والی دعا ہے اس میں بڑی برکت ملتی ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے کہ باہر سے آتے ہی گھر میں آ کر کہے السلام علیکم بڑی نیک دعا ہے اس کے اندر یاد رکھو ہمیشہ جب بھی ایک دوسرے سے ملو حتیٰ کہ جب اپنے گھر میں آؤ یا گھر

سے جاؤ تو ہمیشہ کہو السلام علیکم یہ بڑی اچھی عادت ہے۔ کبھی تم چھوٹے چھوٹے تھے ایسی ضرورتیں ماں باپ جن کو پورا کرتا ہے، تم بڑے ہوجاؤ گے، کمانے کے قابل ہوجاؤ گے تمہارے ماں باپ بوڑھے ہوجائیں گے، پھر تمہارے رشتہ دار بھی ہوں گے پڑوسی بھی ہوں گے، یہ سب ہوں گے ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرو بہت نیک سلوک کرو بہت اچھا سلوک کرو اُن کی جو ضرورتیں ہوں اُن ضرورتوں کو پورا کرو۔ کسی کو ڈانٹو نہیں جھڑکو نہیں، پیار اور محبت سے اُن کے ساتھ پیش آؤ۔ ان سب باتوں کو احسان کہا جاتا ہے دوسروں کی ضرورت کو پورا کرنا۔ وہ احسان نہیں جو ہمارے ہاں ہے کسی کے اوپر احسان کردیا پھر اسے جتلاتے پھر رہے ہیں صاحب۔ اس کے سر پر چڑھے ہوئے ہیں کہ میں نے تم پر احسان کیا بالکل یہ معنی نہیں ہیں ایسی کبھی بات نہ کرنا۔ دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کرو سمجھ گئے بچو۔

وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَـارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَـارِ الۡجُـنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَـنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ وَمَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ (4:36) یعنی پکا مومن وہ ہے جو والدین کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ، اُن کے ساتھ جو کام کاج نہ کرنے کے قابل رہیں، ہمسائیوں کے ساتھ خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا غیر رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ تمہارے پڑوس میں رہتا ہے اس کے اوپر اگر کوئی مصیبت آ گئی ہے ہمیشہ اس کے ساتھ نیک سلوک کرو، دوستوں کے ساتھ بھی، ملنے جلنے والوں کے ساتھ بھی، جو تمہارے ماتحت کام کرتے ہیں اُن کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور آگے بڑھو تم کہیں جا رہے ہو تم نے دیکھا کہ ایک بچہ نالے میں گر گیا ہے ایک دو بچے ہیں جو اُس کو نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اُس کے بھائی بہن ہوں گے اُن سے وہ نکلتا نہیں اور کیا تم کھٹ کھٹ کرتے یوں آگے چلے جاؤ گے؟ تم کہو گے کہ مجھے کیا ہے میرا نہ تو بھائی نہ کوئی رشتہ دار ہے نہ میں اسے جانتا ہوں میں خواہ مخواہ ایسا کیوں کروں؟ بالکل نہیں قرآن شریف کا حکم ہے وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى‌ (5:2) یاد رکھو اچھے

> ایسا نہ کرو کہ حاکموں کو رشوت دے کر دوسروں کا مال ناحق طور پر تم لے لو اور یہ سمجھو کہ بس یہ میں نے لیا ہے مجھے تو حاکم نے فیصلہ کر کے دے دیا ہے۔ ارے بھئی تم نے رشوت دی ہے رشوت سے تم نے یہ مال لیا

کاموں میں نیکی کے کاموں میں دوسروں کی مدد کرو اور اگر کوئی خراب کام کرتا ہے تو وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ‌ (5:2) بُرے کاموں میں بالکل کسی کی مدد نہ کرو، اچھے کاموں میں ضرور ایک دوسرے کی مدد کرو۔ سمجھ گئے اب اور آگے چلو تم کوئی کام کرنا چاہتے ہو خود سوچو کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے اور کیا تمہیں از خود اس کا فیصلہ کر لینا چاہئے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ مشورہ کرو ان سے پوچھو کہ بھئی یہ بات ہے تم کیا چاہتے ہو، کون سے بات اچھی ہے؟ مشورہ تو کرو۔ وہ کہتا ہے کہ مومن وہ ہے وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ‌ (42:38) تم سارے کام ایک دوسرے کے ساتھ آپس میں مشورہ کرنے کے بعد کیا کرو۔ مشورہ کرنا بہت اچھا ہوا کرتا ہے بڑی اچھی اچھی باتیں دوسروں کے تجربے سے معلوم ہوجاتی ہیں۔ فیصلہ تو خود ہی کرو لیکن مشورہ تو دوسروں کے ساتھ ضرور

کرو۔ مشورہ کرنا بڑا ضروری ہے۔ کئی قسم کے اور بچے آپ کو ملیں گے وہ اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھیں گے کوئی بات کرو گے تو کاٹنے کو دوڑیں گے۔ میل ملاپ کوئی نہیں یونہی بیٹھے ہیں۔ یہ کوئی بات بھی نہیں۔ نہیں بالکل ایسا نہیں ہونا چاہئے قرآن شریف کہتا ہے:

وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (21:18)

لوگ خندہ پیشانی سے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ تو یہ بہت ضروری بات ہے۔ الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جانا بڑی بُری بات۔ اور آگے بہت بڑی بات ہے اچھی طرح سے سننا توجہ سے، بڑی ضروری بات آئی ہے اور ضروری بات یہ ہے کہ جب بھی کسی سے وعدہ کرو۔ ہمیشہ اس وعدہ کو نبھاؤ ہمیشہ اسے پورا کرو۔

قرآن شریف میں ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (17:34) ہمیشہ وعدہ پورا کرو یاد رکھو جب تم وعدہ کر لیتے ہو تم اسے پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہو۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی ذمہ داری کو کس طرح پورا کیا۔ اس لئے وعدے کو ہمیشہ پورا کرو یہ نہ کرو کہ وعدہ جلدی سے کر لیا اس کے بعد (سوچو کہ) کون سی بات ہے وقت کو ٹالنے کے لئے۔ یہ چیز کر لی تو یہ تو بہ بڑی بُری بات ہے۔ یہ وقت ٹالنے کے لئے کسی سے کچھ کہہ دینا پہلے تو یہ جھوٹ بولا اور پھر جب اس نے تم پر یقین کر لیا تو تم نے وعدہ پورا نہ کیا بڑی بُری بات، مسلمان کا یہ شیوہ نہیں مومن کی یہ شان نہیں ہے۔ مومن کی زندگی میں ہے کہ جب وعدہ کرو تو پورا کرو۔ اب اس سے بھی بڑی بات ہے کہ جب کوئی شخص تمہارے پاس اپنی کوئی چیز امانت کے طور پر رکھے تو کبھی خیانت نہ کرو۔ اسی طرح سے اس امانت کو واپس کرو۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ (4:58) اللہ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ جس کی امانت ہو اُس کی امانت واپس دے دیا کرو۔ خواہ اس نے کسی کے سامنے دی ہو یا اکیلے میں دی ہو۔ سنو بھئی امانت میں اور باتیں بھی داخل ہو جاتی ہیں تمہاری نگاہ نہیں اُدھر جائے گی۔

اگر کوئی شخص آ کر راز کی بات کرتا ہے وہ بھی اس کی امانت ہے لیکن ایک بات سمجھ لو وہ کسی کی خرابی یا بُرائی کی بات نہ ہو۔ ہاں وہ تو قرآن شریف نے کہا ہے کہ بُرائی کی باتوں میں کسی کی مدد بھی مت کرو۔

اچھی باتیں کرو اور اگر کسی نے آ کر اچھی بات کہی اور کہا کہ اسے اپنے تک رکھنا اس کو ظاہر نہ کرنا۔ اسے اس وقت تک ظاہر نہ کرنا۔ اگر ایسی بات ہو تو اسے اسی وقت کہہ دو کہ نہیں بھئی یہ غلط ہے میں اس قسم کی ذمہ داری نہیں لے سکتا لیکن جب کسی سے وعدہ کر لو پھر اس وعدے کو ضرور پورا کرو۔ سمجھ لیا تم نے؟ دیکھا بچو کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں کتنی اچھی اچھی باتیں ہیں۔ اور قرآن شریف ہمیں بتاتا ہے۔ میں آپ کو ایک اور ایسی بات بتاتا ہوں جو اس وقت تو آپ کے کام نہیں آئے گی بڑے ہو کر آئے گی۔ سنا ہے کبھی کہ فلاں آدمی فلاں افسر بڑی رشوت لیتا ہے؟ بھئی رشوت ہوتی کیا ہے؟ آدمی کا کسی کے سامنے مقدمہ پیش ہو یا کوئی ایسی بات ہو جس نے فیصلہ کرنا ہے حاکم نے، ایک شخص کا حق ہے دوسرے شخص کا حق نہیں ہے وہ شخص وہ حاکم اُس آدمی جس کا حق نہیں ہے اُس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہے، ناحق ظلم کر کے، دوسرے کے حق میں رشوت لے کر فیصلہ کر دیتا ہے

اسے کہتے ہیں رشوت۔ کتنی بُری بات ہے رشوت لینا بہت بُری بات ہے۔ قرآن شریف کہتا ہے آپس میں ایک دوسرے کا مال غلط طریقے سے بالکل مت کھاؤ۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (2:188) ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ چوری کرنا بھی ناجائز چیز ہے دھوکہ دینا بھی ناجائز ہے کسی کی امانت میں خیانت کرنا بھی ناجائز ہے اور کسی کو رشوت دینا بھی ناجائز ہے رشوت دے کر دوسرے کا حق لینا یہ بھی ناجائز طریقہ ہے۔ کسی بھی ناجائز طریقے سے کام مت کرو۔ اپنا حق لو کھلے کھلے بندوں کوئی چیز اس کے اندر چھپائی نہ ہو۔ کسی پر ظلم نہ کرو کسی پر زیادتی نہ کرو کسی سے بے انصافی نہ کرو اور جب تم بڑے ہو کر افسر بن جاؤ گے اللہ تمہیں بہت بڑا افسر بنائے تو اُس وقت کبھی رشوت نہ لینا یاد رکھو لوگ کیا کہتے ہیں رشوت کیوں دیتے ہیں تاکہ دوسروں پر ظلم ہو اور جو چیز اپنے حق کی نہیں ہے وہ ان کو مل جائے۔ قرآن شریف کہتا ہے کہ یاد رکھو کبھی اپنا مال ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ (2:188) ایسا نہ کرو کہ حاکموں کو رشوت دے کر دوسروں کا مال ناحق طور پر تم لے لو اور یہ سمجھو کہ بس یہ میں نے لیا ہے مجھے تو حاکم نے فیصلہ کر کے دے دیا ہے۔ ارے بھئی تم نے رشوت دی ہے رشوت سے تم نے یہ مال لیا ہے بڑی بُری بات ہے۔ اب تمہیں چھوٹی چھوٹی سی باتیں پتا ہیں۔ لیکن باتیں چھوٹی چھوٹی سی ہیں لیکن ان کے اوپر عمل کرنا پڑے گا ایک بات تو یہ کہ کبھی دوسرے کے گھر میں اجازت کے بغیر مت داخل ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ (24:27)

اے ایمان والو اپنے گھروں کے علاوہ جب کسی دوسرے کے ہاں جاؤ ہمیشہ اجازت لے کر۔ اجازت کے بغیر اُن کے مکان میں مت داخل ہو۔ اور جب اُن کے گھروں میں داخل ہو تو اُن کو السلام علیکم کہو۔

لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا (24:28) اور اگر دیکھو کہ گھر میں کوئی نہیں ہے تنہا ہے وہ گھر، اکیلا ہے تو اُس کے اندر مت جاؤ باوجود اس کے کہ وہ گھر میں آ جائے حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ (24:28) اور تمہیں اجازت دے دیں تو پھر دوسرے کے گھر میں جاؤ۔ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا (24:28) اگر وہ کہے نہ بھئی اس وقت نہیں دوسرے وقت پر آنا فوراً واپس آ جاؤ۔ اس کا بُرا مت مناؤ ہوسکتا ہے وہ فارغ نہ ہو وہ کہے اس وقت بھئی نہیں دوسرے وقت آؤ دوسرے وقت چلے جاؤ اس وقت واپس آ جاؤ اور اس کا بُرا بھی کبھی نہ مناؤ۔ سمجھ لیا تم نے۔

جب تم بیٹھو، دیکھو تم اس وقت بیٹھے ہوئے ہو دیکھو ایسے بیٹھو قرآن شریف میں ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (58:11) اے ایمان والو جب تم سے کہا جائے جہاں بیٹھے ہوئے ہو مجلس میں ذرا جگہ کھول دو تو جگہ کو کھول دیا کرو کسی دوسرے کے لئے جگہ کر دیا کرو اللہ تمہارے لئے بھی کشادگی پیدا کر دے گا اور جب تم سے کہا جائے کہ اب مجلس برخاست ہوتی ہے تو اُٹھ کر چلے جایا کرو اور یہ نہ ہو کہ جب کہا جائے کہ ہاں صاحب مجلس برخاست ہوتی ہے اور اس کے بعد بھی تم وہاں

بیٹھے ہی رہو۔ قرآن شریف نے ایک اور بات کہی ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ ؕ (33:53) یہ اس زمانے میں کہا جب رسول اللہ ﷺ حیات تھے آپ کے گھر میں لوگ جایا کرتے تھے۔ کہا کہ اے ایمان والو نبی کے گھروں میں بنا بلائے نہ جایا کرو اور جب تمہیں کھانے کے لئے بلایا جائے تو اُس سے پہلے جلدی سے نہ آجایا کرو کہ کھانا پک رہا ہے اور تم انتظار کر رہے ہو بلکہ جب تمہیں بلایا جائے جو وقت دیا جائے اُس وقت آیا کرو اور جب کھانے سے فارغ ہو چکو تو پھر چلے جایا کرو اس کے بعد یونہی باتیں کرنے کے لئے نہ بیٹھے رہا کرو تم بیٹھے ہوئے ہو اور گھر والوں کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتے ہیں تمہیں بھائی یہ قرآن شریف میں ہے اس نے کہا ہے کسی کی غیبت نہ کرو۔ پیٹھ پیچھے کسی کی بُرائی نہ کرو۔ (49:12) پھر اُس نے کہا ہے کہ کسی کے بُرے بُرے نام نہ رکھو دیکھو تمہیں معلوم ہے نا لڑکے جو بُرے لڑکے ہیں وہ ایک دوسرے کا الٹا الٹا نام ڈال دیتے ہیں۔ بالکل کسی کا الٹا نام نہ رکھو۔ قرآن شریف میں ہے وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ (49:11)

کس کے خلاف یونہی الزام نہ لگاؤ، تہمت نہ لگاؤ یہ بھی بہت بُری بات ہے کسی سے تمسخر نہ کرو مذاق نہ اُڑاؤ کسی کا وہ بھی بڑی بُری بات ہے۔ یہ بھی سارے جتنے احکام ہیں یہ بھی سورۃ 49 کی آیت نمبر 11 کے اندر ہی ہیں۔ یونہی بدظنی نہ ایک دوسرے کے متعلق پیدا کیا کرو۔ بات کی تحقیق نہ کرو، یونہی بیٹھ کر کہتے رہو کہ فلاں آدمی تو بُرا آدمی ہے۔ وہ یہ کرتا ہے وہ کرتا ہے۔ بڑی بُری بات ہے۔ قرآن شریف کہتا ہے بالکل کسی کے متعلق بدظنی کی بات نہ کرو ہاں اگر کسی کے متعلق کوئی بات پتا چلے تو ہمیشہ اس سے پوچھو اس کی تحقیق کرو اور تحقیق کرنے کے بعد پھر کسی نتیجہ پر پہنچو اور دیکھو بچو ایک بات سب سے بڑی اور وہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم نے تمام انسانوں کو عزت والا بنایا ہے یاد رکھو کوئی امیر ہوتا ہے کوئی غریب ہوتا ہے اور عام طور پر کہتے ہیں یہ چھوٹے گھرانے میں پیدا ہوا اور یہ بڑے میں پیدا ہوا اور کہتے ہیں یہ سید ہے یہ پٹھان ہے اور یہ جلاہا ہے یہ موچی ہے۔ یہ ساری باتیں قرآن کے خلاف ہیں ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے عزت والا ہے۔

قرآن شریف میں ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ (17:70) ہم نے تمام انسانوں کو عزت والا بنایا ہے۔

اس لئے ہر انسان کی عزت کرو کیونکہ خدا نے اُن کو عزت والا بنایا ہے اور کسی کی بے عزتی نہ کرو اور آخری بات یہ یاد رکھو تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:2) جو اچھی اچھی باتیں کہو جو تم دوسروں سے کہو پہلے اس کے اوپر خود عمل کرو۔ عمل کرنے سے ساری بات ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ تم دوسروں سے تو اچھی اچھی باتیں کہتے رہو ہمیشہ دوسروں کو وصیت کرتے رہو اور آپ اس غلط راستے کی طرف چلتے رہو یہ بہت بُری بات ہے۔ جو بات اچھی ہو اس کو مانو پھر اس پر عمل کر کر کے دیکھاؤ اور پھر دوسروں کو بتاؤ۔ بیٹا اب تمہارے درس ختم ہو گئے۔ السلام علیکم۔ دیکھا تم نے کتنی اچھی اچھی باتیں قرآن شریف بتاتا ہے اب بیٹا جب تم دوسری دفعہ چھٹیوں کے بعد آؤ گے پھر تمہیں ہم اس قسم کے اور سبق یاد کروائیں گے۔

The Human Self and Allah

Episode No. 3

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

(1) As a result, thisfact becomes evident that, whereas he is higher and superior tothe whole of the universe, his status is far lower when compared to his greatest criterion (the Divine Self). [In *Salat*,*Qayaam*(standing posture) and *Sajda*(prostration) are representationsof these very two states. In *Qayaam* the objective is the affirmation of the human self and its superioritycompared to the whole universe, and in *Ruku* (bowing) and *Sajud* (prostration), the willing obedience and subservient status of the human self when compared to the Divine Self].

(2) From this it also becomes clear that there can be nothing in the universe like unto man, because in the universe the only possessor of personality is man. Because the Western materialistconsiders himself (like other things of the universe) to be a product of matter,he can therefore become absorbed in this world of colour and fragrance, but the one who holds*Eimaan* in the Quranic concept of life finds himself to be unique in this physical universe. His companion can be another possessor of a self, i.e. one human being can be the companion of another at an equal level, and at a higher level the companion of man can be Allah Himself. This is the reason that Rasul-ullah has called Allah '*Al-Rafiqul-Aala*' (Companion of a higher status).

1.12 Companion of Allah

The subject of companionshipwith Allah leads us towards another important aspect of reality. We observe that in the outer universe the results of the Divine laws manifest themselves in a tangible form in front of us, some rapidly, others far later. For example, the seed of any tree contains the potential that if it is nourished according to the Divine law then one day it will become a tall and sturdy tree for all to see. This outcome can come to

fruition in front of us duringour own lifespan. But there are some schemes of nature which are such that their results become established after many thousands of years. For example,for the first life cell to reach to the human form, after traversing differentevolutionary stages,occurredaftermillions of years.

But we also observe that if man joins hands with that of nature, then not only is there a significant reduction in this time periodwithin which some acthad to bear a result (solely according to the laws of nature), butthere is also a manifold increase in its beauty and attraction, utility and benefit. That same plant which under normal circumstancesblossomed with flowers after six months and that, too,inonly one colour, in the laboratories of Europe can bear multicoloured flowers within twenty-four hours. This means that when man becomes the companion of the Divine laws, then swiftnessis added to the creative programme of Allah and beauty is created in its outcome.

The form in which the Divine laws,as bearers of results, exists in the outer universeis also that same form which exists in the human world. For example, the Quran declares:

Nay, We hurl the truth against falsehood, and it knocks out its brain, and behold, falsehood does perish! (21:18)

This principle is functioning in the universe that there is a continuousbattle between *Haqq* (truth) and *Batil* (falsehood)in it, and in this clash*Haqq* smashes the head of *Batil*and thus*Batil* ultimately becomes destroyed and eradicated. In other words, constructive forces ultimately overcome destructive forces and in this way the universe keeps advancing forward while traversing through its evolutionary stages. As the Quran has stated, this is the law of nature:

...Verily a day in the sight of your Sustainer is like a thousand years of your reckoning. (22:47)

...in a Day, the measure whereof is (as) fifty thousand years. (70:4)

But if human companionship is unitedin this then this victory of*Haqq* can materialize in a few days. But this companionship can only materialise from those men who have a solid conviction in the truth of the Divine laws, and who are busy making efforts and taking actionsfor the development of their self according to these (this is what is called *Eimaan* and righteous

deeds). A group of such individualsiscalled a *Jamaate Momineen* or *Hizbullah*.❶ As a result of the efforts and actions of this *Jamaat*such a society comes into existence in which the Divine laws continue to become effective and manifest results within the minimum of time, and in this way the development of the members of the society continues to take place.

1.13 Individual and Society

The Quran has stated in very clear terms that development of the human self cannot take place as a lone individual, this can only take place within a *Jamaat* (a Quranic society). Addressing the individual, it states:

Enter you, then, among my servants! Yes, enter you My heaven. (89:29-30)

If you wish to enter paradise then enter the *Jamaat* of the menof Allah. In another verse it is stated:

...and be with those who are true (in word and deed). (9:119)

This is the reason that the Quran has declared the solitary cloistersof monasteries and the places of worship of mystics as a concoction of the human mind (57:27) which is contrary to the Deendefined and presentedby Allah. The Deen of Allah becomes established within a society. Deenprovides the principles and values for the mutual relationsof mankind. If some individual goes to a jungle where there is no other human being, then he needsneither Deen nor *Eimaan*, nor can development of his self take place, nor is there any form of evolution of human life. In fact, he cannot even live life at a human level. Therefore, Deen demands collectivism, and the development of the self of an individual is only possible within a society.

1.14 Formulation of a Nation

Now let us take another step forward. When any two human beings in the world set the aim of their life as being only one i.e. there is only one objective and destination in front of them, and the pattern according to which they wish to mould their life is also the same, then the creation of mutual harmony in their outlook and vision is a natural outcome – this is what is called unity of thought and vision, or the sharing of *Eimaan*.

This is that unity of thought and visionwhich the Quran declares as being the reason for the coming together of people i.e. no matter where two persons of the world live, whatever may be their colour, language, race or

❶ *Hizbullah* – this means the party of Allah i.e. those who follow His laws. (Ed)

nationality, if they place the Divine attributes in front of them as external criteria and are engrossed in efforts to develop their self according to these, then both these human beings (despite having differentiations of colour, race, language or nationality) will be members of one*Jamaat* and will be citizens of one nation. The Quran has stated this to be the very criterion for the formulation of nationality. The unity which is produced among men in this way is far stronger and longer lasting than the bonds of blood, colour, language and the relationships of nationality. If this unity keeps spreading, and ever greater numbers of human beings in the world harmonise together in this way and become of one 'colour', then through this the whole of mankind willbecome one universal brotherhood. It is obvious from thisthat the necessary outcome of*Tauheed*of Allah (i.e. keeping His Self as a criterion in front)is the oneness of humanity. Apart from this there is no other basis for the oneness of humanity. The aim and objective of the Quran is that gradually all human beings, by making the *Tauheed* of Allah as the practical model of their life, become one universal brotherhood, and in this way all those differences due to which today the world is turning into a den of beasts,are eliminated.

1.15 *Eimaan* in Allah

From the above explanations this reality becomes apparent to usas to what the concept of Allah is according to the Quran, and what it means to have *Eimaan* in Allah. After this it also becomes clear why the Quran makes this demandfrom all the human beings of the world that they should have *Eimaan* in that AllahWhose concept the Quran has presented. Leaving aside a few atheists in the world, every person, every tribe, every nation is convinced of the existence of God in some form or another. But the Quran declares that your belief inGod in this way is not, in truth,the acceptanceof God; this amounts to recognition of that God whose concept is coined by you or other men likeyou. For example, an individual says that I believe that gold is a good metal, its colour is white,humid air causes it to rust, andstriking it against a hard material shatters it into pieces, and since it is the lightest metal in the world, it is therefore commonly used in the construction of airplanes. It is obvious that the individualwho becomes convinced of the existence of the metal holding these characteristics by calling it 'gold', is in fact denyingthe existence of (real) gold. Only that

person who is convinced of its correct and true characteristics will be acknowledged as accepting the existence of gold. Hence, the belief in God of the individual who may be convinced about God but is not aware of the correct concept of His attributes, is equivalent to denial of the true God. Therefore, *Eimaan* in Allah will be accepted[1] only from the individual who has conviction in that Allah Whose attributes are detailed by the Quran; and those attributes are not noted anywhere other than in the Quran.

1.16 Characteristics of Quranic *Eimaan*

Not only is it the casethat the concept of Allah which the Quran presents is not available anywhere else, but the concept of the relationship which the Quran detailsbetween Allah and man also cannot be found anywhere else. As we have seen, the Quran tells us that:

(1) Allah has control and power over the whole of the universe, but He uses His sovereignty according to His Own laws made by Him, and there is never any change in these laws. In other words, this whole system of the universe is busilyfunctioning within these defined and established laws which areoperational and immutable. These very laws are also functioning in the human world which means that every deed of man produces a defined effect and there is never any exception in this. Though every man has a choice in doing whatever deed he wishes, it cannot happen that he performs a deed of one kindbut creates the effect of some other. Whatever kind of deed it is, the same kind of outcome will result. These results are established according to the laws defined by Allah.

(2) Excepting those attributes which are purely related to the omnipotence and omniscience of Allah (e.g. that none has created Him, nor has He come into existence from nothing), the fundamental attributes of the human self are the same asthe attributes of the Divine Self, with this difference that these attributes of the human self are finiteand in a constrained form,and are also undeveloped.

To Be Continued

[1] Acceptance here means that the human self must have the correct concept in mind in order to benefit from this for the development of the self. It may appear harsh, but this is something we experience in our daily life as well. Though we may genuinely believe something to be true this will not make it a fact, thus we may be holding on to something which is false that will affect our subsequent thought process. (Ed)

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں' انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکام دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو' جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.75
ISSUE
2

Monthly **TOLU-E-ISLAM**
25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

بیادِ غلام احمد پرویز

عبدالعزیز خالد

ہو گیا رخصت بساطِ تنگنائے دہر سے
اک خدا آگاہ، روشن فکر مردِ خود گرے
دانش و بینش کا پیکر، پُر بہار و خوش صفات
کلک و قرطاس و لبِ اظہار جس کی کائنات
اک ادارہ، ایک تحریک، اک مشن تھی جس کی ذات
شمع رکھی جس نے روشن فِکرِ قرآنی کی تاحینِ حیات
طعنے گمراہی کے سنتا، وار بدنامی کے جو سہتا رہا
بات اپنے دل کی بیباکی سے لیکن برملا کہتا رہا
مہر خاموشی لگی خوفِ فسادِ خلق سے
جس کے ہونٹوں پر نہ پل بھر کے لئے
(کیوں نہ ہو جدت پسندی کو اِبا تقلید سے
کیا دماغِ نکتہ پرور کور مغزوں سے ڈرے؟)
جہل فتوے جس کے کفر و قتل کے دیتا رہا
کشتیِ عمرِ رواں جو بحرِ ہیبت ناک میں کھیتا رہا
قرض مرگِ ناگہاں سے روز جو نقدِ نفس لیتا رہا

زندگی بھر تنگ ظرفی سے کیا جس نے نباہ
اک زمانہ جس کے عزم و استقامت کا گواہ
بے گناہی کے سوا کیا تھا بھلا اس کا گناہ؟
تھی بقولِ محرماں اس کو نہ حرصِ مال و جاہ
باوجودِ بے نوائی بے محابا، بے پناہ
کچھ نہ رکھتا تھا وہ اقبالی قلندر
جُز دو حرفِ لاالٰہ

کوہکنؔ کی جس میں پامردی، یہ وہ پرویز تھا
اور اسی باعث تھی شیرینِؔ خرد اس پر فدا
صاحبِ فرہنگے، اندیشہ سگالے، عاقلے
کہتے تھے جس کے عقیدت مند ''بابا جی'' اُسے
وہ وفاداری بشرطِ استواری کی مثال
عمر بھر کی بے قراری کا ثمر جس کا کمال
تھے بہم جس میں مذاقِ منطق و ذوقِ جمال
آگہی کی اِک فروزاں شمع تھی جو بجھ گئی
آہ بیدردی تری! اے زندگی! اے زندگی!